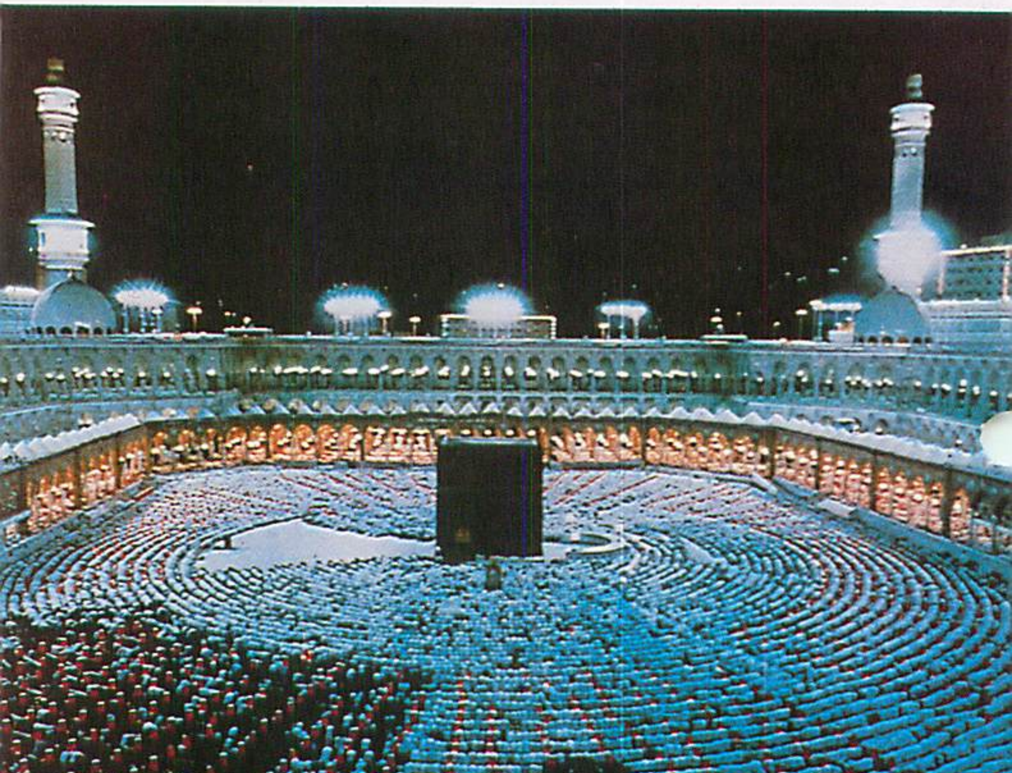
الرسالہ
Al-Risala

July 1994 Issue 212 Rs. 6

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



اصول پسند انسان ہر ایک کے لیے اچھا انسان ہے
اور مفاد پسند انسان صرف اپنے لیے اچھا انسان۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعہ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیاتِ اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	30/-
تعددِ ازدواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسول	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے جہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

English

God Arises	85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسول	25/-
میدانِ عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقتِ روزہ	150/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۹۴ ، شمارہ ۲۱۲

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-Mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

جنت کا ٹکٹ

مغربی دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ انھوں نے کہا: مجھ کو تو جنت کا ٹکٹ چاہیے، مجھ کو آپ صرف یہ بتائیے کہ جنت کا ٹکٹ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ جنت کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ یہ جنتی ٹکٹ کا معاملہ نہیں، یہ جنتی شخصیت کا معاملہ ہے۔ آخرت کی قیمتی جنت اس آدمی کو ملے گی جس نے اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ جنت میں داخلہ کسی کو "ٹکٹ" کے ذریعہ نہیں ملے گا۔ جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے، اپنے وجود کی قیمت دے کر ہی کوئی شخص جنت کی دنیا میں اپنے لیے داخلہ پا سکتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت تزکیہ کرنے والوں کے لیے ہے (ذلك جزاء من تزكى) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ آدمی مزکیٰ شخصیت لے کر وہاں پہنچا ہو۔ یعنی وہ ایک ایسا انسان ہو جس کے اندر پاک روح بسی ہوئی ہو، جس کا دل اور دماغ آلائشوں سے پاک ہو۔ جس نے اپنے اندر ربانی شخصیت کا باغ اگایا ہو۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس کے ایک طرف کیچڑ ہے اور دوسری طرف صاف وشفاف پانی۔ آدمی چاہے تو اپنے کو کیچڑ میں گندا کرے، اور چاہے تو صاف پانی میں نہا کر صاف ستھرا بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو گندا کریں، وہ آخرت میں جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو پاک کریں، ان کو جنت کی نعمت گاہوں میں بسایا جائے گا۔

اعتراف کے موقع پر اعتراف کرنا اپنی شخصیت کو پاک کرنا ہے اور اعتراف کے موقع پر بے اعترافی کا رویہ اختیار کرنا اپنی شخصیت کو گندا کرنا۔ اسی طرح ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتا ہے اور دوسرا شخص پست اخلاق کا۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص حق تلفی کرتا ہے اور دوسرا شخص حق رسانی۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص امین ثابت ہوتا ہے اور دوسرا شخص خائن۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص تواضع کے راستہ پر چلتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کے راستہ پر۔

ان میں سے اول الذکر آدمی اپنی شخصیت کو پاک کرنے والا ہے، وہ جنت کی نفیس دنیا میں داخلہ پائے گا۔ ثانی الذکر آدمی اپنی شخصیت کو گندا کرنے والا ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

زکوٰۃ وصدقات

جب ایک آدمی زکوٰۃ اور صدقہ کے تحت کسی کو کچھ دیتا ہے تو بظاہر وہ کسی غیر کو دے رہا ہوتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا رخ خود دینے والے کی طرف ہوتا ہے۔ دوسرے کو دے کر آدمی خود اپنی پاکی کا اہتمام کرتا ہے۔

ایسا کرکے آدمی اپنے دل سے مال کی محبت کو نکالتا ہے۔ وہ اس یقین کو تازہ کرتا ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ خدا کی امانت ہے نہ کہ اس کی ذاتی ملکیت۔ اس طرح وہ اپنے اندر اس احساس کو جگاتا ہے کہ اس کے اوپر دوسروں کا حق ہے۔

زکوٰۃ یا صدقہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی انسان کو دے مگر وہ اس کا بدلہ خدا سے پانے کی امید رکھے۔ وہ یک طرفہ طور پر دوسرے انسانوں کا خیر خواہ اور مددگار بنے۔ وہ اپنی زندگی میں ایسے لوگوں تک کا حق سمجھے جن سے اسے کچھ پانے کی امید نہ ہو۔

زکوٰۃ دینا گویا کہ دوسروں کے لیے نفع بخش بننا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ آدمی کے لیے اس یاددہانی کا ذریعہ ہے کہ تم کو اس دنیا میں مانگنے والا نہیں بننا ہے بلکہ دینے والا بننا ہے۔ تم کو اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ تمہارا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہے، وہ کبھی نیچے نہ ہونے پائے۔

زکوٰۃ گویا ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ زکوٰۃ دینے والا اس لیے دیتا ہے تاکہ وہ خدا سے پائے۔ وہ اس لیے دوسروں کے کام آتا ہے تاکہ خدا اس کے کام بنادے۔ وہ اس لیے یک طرفہ طور پر مدد پہنچاتا ہے تاکہ خدا بھی اس کو یک طرفہ طور پر اپنی رحمت اور بخشش کے سایہ میں لے لے۔

اس دنیا میں بظاہر ایک آدمی بے مال ہے اور دوسرا آدمی صاحب مال۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی محتاج ہے۔ کیوں کہ کسی کا مال بھی ذاتی مال نہیں۔ ہر آدمی کا مال خدا کا عطیہ ہے۔ مال والا ایک آدمی جب کسی بے مال والے کو کچھ دیتا ہے تو اس عمل کے ذریعہ وہ خود اپنی ہی حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے۔ وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ میں بھی وہی ہوں جو تم ہو۔ اگر خدا چاہے تو کل کے دن وہ میرا حال تمہارے جیسا کر دے اور تمہارا حال میرے جیسا۔

حکمتِ دین

ایک صاحب نے اپنے حج کا سفرنامہ لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۸ بار حج کیا ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک عالم بھی ہیں۔ سوال کرنے والے کا سوال یہ تھا: "یہ ایک عجیب بات ہے کہ حجر اسود جو محض ایک پتھر ہے اس کو تو لوگ چومنے کے لیے ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ اور جمرات بھی پتھر ہی کی شکل میں نصب ہیں مگر لوگ ان کو پتھر مارنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ ایک پتھر کو تو لوگ عقیدت سے چومتے ہیں، جب کہ دوسرے پتھر پر وہ پتھراؤ کرتے ہیں"۔

مذکورہ صاحب نے جواب دیا کہ اسلام اطاعت اور فرماں برداری کا نام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرنے کے لیے عقل اور دلیل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ صرف تسلیم و رضا کے جذبہ کے ساتھ اس پر عمل کرنا چاہیے۔ (البلاغ، جولائی ۱۹۹۳)

یہ جواب درست نہیں۔ اسلام بلاشبہ تعمیل حکم کا نام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ جس چیز کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے وہ سراپا حکمت پر مبنی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاہ ولی اللہ دہلوی کو حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اصل یہ ہے کہ یہ حجر میں فرق کا معاملہ نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حجر میں فرق کا معاملہ ہے۔ نہ محض پتھر کی وجہ سے ایک کا احترام ہے اور نہ محض پتھر کی وجہ سے دوسرے کی بے احترامی۔ اصل یہ ہے کہ دونوں پتھر الگ الگ چیزوں کی علامت ہیں۔ حجر اسود ابراہیم خلیل اللہ کی علامت ہے اس لیے وہ قابلِ احترام ہے۔ اور جمرات شیطان لعین کی علامت ہے اس لیے وہ سنگ باری کا مستحق ہے۔ حجر اسود کو چومنا سنت ابراہیمی سے عقیدت کا اظہار ہے اور جمرات کو پتھر مارنا عمل شیطانی کے ساتھ نفرت کا اظہار۔

ایک فوج اپنے ملک کے جھنڈے کا احترام کرتی ہے، مگر وہ دشمن ملک کے جھنڈے کو پیروں تلے روندتی ہے۔ حالانکہ دونوں ہی کپڑا ہیں۔ دونوں میں یہ فرق اس لیے ہے کہ ایک جھنڈا وطن دوستی کی علامت ہے اور دوسرا جھنڈا وطن دشمنی کی علامت۔

پچیس سال

البرٹ سابن (Albert Sabin) ایک امریکی سائنس داں ہے۔ وہ ۱۹۰۶ میں پولینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ اس کے والدین ترک وطن کر کے امریکہ آ گئے۔ یہیں ۳ مارچ ۱۹۹۳ کو اس کی وفات ہوئی۔ اس نے پچیس سال کی لگاتار محنت اور تجربہ سے ایک ایسا پولیو ویکسین (polio vaccine) تیار کیا جو کہ منہ کے راستہ سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جب کہ عام طور پر ویکسین انجکشن کے ذریعہ اندر داخل کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اب تک ۵۰۰ ملین لوگ اس کی ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

استحقاق کے باوجود البرٹ سابن کو نوبیل انعام نہیں ملا۔ مگر اس نے اس کی پروا نہ کی۔ اس نے کہا کہ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے ایک ایسی جگہ مل جائے جہاں میں اپنا کام کر سکوں:

I only ask for a place to work.

اپنی تحقیق کے دوران اس کو بے شمار مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر مایوسیوں اور ناکامیوں سے بے پروا ہو کر اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق آخری کامیابی کی منزل تک پہنچ گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ آپ کتنے ہی اچھے ہوں، آپ ایک سائنس داں نہیں بن سکتے جب تک مایوسیوں کے ساتھ جینا نہ سیکھیں:

No matter how good you are, you cannot be a scientist unless you learn to live with frustration.

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا عام اصول ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر کامیابی صرف اس باہمت شخص کے لیے ہے جو "۲۵ سال" تک یکسو ہو کر عمل کر سکے۔ جو ناکامیوں کے درمیان اپنا سفر جاری رکھے۔ جو بار بار گرنے کے باوجود بار بار اٹھے۔ جو اعتراف اور تحسین سے بے پروا ہو کر اپنے مقصد کے حصول میں سرگرم رہے۔ جس کی طاقت کا خزانہ اس کے اپنے اندر ہو نہ کہ اس کے باہر۔

جو لوگ عدم اعتراف کی شکایت کریں۔ جو ناموافق حالات سے گھبرا اٹھیں۔ جن کی نظر مواقع سے زیادہ مسائل پر رہتی ہو، وہ اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

دو طریقے

دادا قسم کے ایک آدمی کو اپنے ایک پڑوسی سے شکایت ہوگئی۔ دادا کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا: دیکھو، میں اس شخص کو سبق سکھاتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے اپنے پڑوسی کو ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اس کے نتیجہ میں پڑوسی بظاہر خاموش ہوگیا۔ مگر اس کے دل میں ایک اور زیادہ شدید چیز پیدا ہوگئی۔ وہ نفرت تھی۔ اس کی نفرت بڑھتی رہی، بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن موقع پاکر اس نے دادا کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں دوسری مثال تاجر کی ہے۔ تاجر کو اگر اپنے ایک گاہک سے شکایت ہو جائے تو وہ گاہک کو سبق پڑھانے کے ذہن سے نہیں سوچے گا۔ اس کے بجائے وہ گاہک کا دل جیتنے کی کوشش کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوش ہو کر اور زیادہ پختہ طور پر اس کا گاہک بن جائے گا۔

شکایت کے معاملہ میں پہلا طریقہ اسلام کا طریقہ نہیں۔ صرف دوسرا طریقہ ہی اسلام کا طریقہ ہے۔ اس کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ اچھا سلوک اور برا سلوک دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ کسی شخص سے تم کو برائی پہنچے تو تم اس کا بدلا اچھائی کے ساتھ دو۔ اس کے بعد تم دیکھوگے کہ جو شخص تمہارا دشمن دکھائی دے رہا تھا وہ تمہارا گہرا دوست بن گیا ہے (حم السجدہ ۳۴)

سبق سکھانے کا طریقہ باہمی نفرت پیدا کرتا ہے، دل جیتنے کا طریقہ باہمی دوستی کو بڑھاتا ہے۔ پہلی صورت میں مسئلہ بڑھتا ہے، دوسری صورت میں مسئلہ کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ پہلا طریقہ حیوانیت کا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ انسانیت کا طریقہ۔ پہلے طریقہ میں روحیں گندی ہوتی ہیں۔ دوسرے طریقہ میں روحوں کو صفائی اور سکون کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ پہلا طریقہ انسانی پستی کا طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ انسانی بلندی کا طریقہ۔

جو لوگ معاملہ پیش آنے کے بعد بھڑک اٹھتے ہیں اور فوری ردعمل کے تحت اپنا کام کرتے ہیں وہ سبق سکھانے والے طریقہ کو اپناتے ہیں۔ لیکن جو لوگ معاملہ پیش آنے کے بعد سوچیں اور نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنا اقدام کریں وہ ہمیشہ دل جیتنے والے طریقہ کو اختیار کریں گے۔

استقلال

فارسی کا مثل ہے کہ یک درگیر و محکم گیر۔ یعنی ایک در کو پکڑو اور وہیں مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ آپ ایک پودا زمین میں لگائیں، اور اس کے بعد ہر روز اس کی جگہ بدلتے رہیں تو ایسا پودا کبھی بڑا درخت نہیں بن سکتا۔ ہر بار جب آپ اس کو کھود کر نکالیں گے تو اس کی کچھ جڑیں کٹ جائیں گی۔ اس طرح بار بار جڑوں کے کٹنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس قابل ہی نہیں رہے گا کہ زمین میں جماؤ حاصل کرے اور پھر اوپر اٹھ کر فضا میں اپنی شاخیں پھیلائے۔

ایک آدمی پرائیویٹ ملازمت میں ہے۔ وہ اگر ایسا کرے کہ آئے دن ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جائے تو وہ لوگوں کی نظر میں ہمیشہ بے قیمت بنا رہے گا۔ اگر وہ ایک جگہ وفاداری کے ساتھ رہتا تو وہاں اس کو قدر دانی ملتی۔ اپنے عمل سے وہاں وہ اپنے مالک کا دل جیتتا اور پھر اس کو ترقی کا درجہ ملتا۔ لیکن جگہ بدلنے کی صورت میں وہ ہمیشہ پریشان رہے گا۔ وہ اپنے لیے ایک قابل اعتماد زندگی بنانے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں استقلال کے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔

ایک ڈاکٹر اگر بار بار اپنے کلنک کی جگہ بدلے۔ یا ایک دکان دار بار بار ایک دکان کو چھوڑ کر دوسری دکان شروع کرتا رہے تو نہ ایسا ڈاکٹر کبھی کامیاب ہوگا اور نہ ایسا دکان دار۔ دونوں ہی آخر کار ترقی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

کوئی آدمی جب ایک سماج میں رہتا ہے تو وہ اپنے کردار سے اپنی ایک تاریخ بناتا ہے۔ یہ تاریخ ہر انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہے۔ اگر آپ کی یہ تاریخ بن جائے کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے، آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے، آپ خیانت نہیں کرتے۔ آپ کسی کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ نہیں کرتے۔ آپ اپنے اصولوں سے کبھی نہیں ہٹتے، آپ جو کام کرتے ہیں ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں، تو آپ کی یہ تصویر آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہوگی۔

مگر یہ تصویر اسی وقت بنے گی جب کہ آپ ایک جگہ دیر تک ٹھہریں۔ اگر آپ بار بار جگہ بدلیں تو لوگوں کی نظر میں آپ کی تصویر بھی نہیں بنے گی۔ آپ لوگوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکیں گے اور اعلیٰ ترقی کے درجہ تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

ذکر کی حقیقت

ایک صاحب نے پوچھا کہ حدیث میں اذکار کی جو روایتیں ہیں، ان کی کیا حقیقت ہے اور وہ کس حد تک ضروری ہیں۔ کیا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف اوقات میں ان اذکار کو پڑھنے کا اہتمام کرے۔ میں نے کہا کہ یہ ضروری اور غیر ضروری کا معاملہ نہیں، یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو ایمان کے بعد لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ جہاں ایمان ہوگا وہاں ذکر بھی ضرور پایا جائے گا۔ ایمان اور ذکر دونوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ممکن نہیں۔

ذکر کیا ہے۔ ذکر دراصل ایک اندرونی حقیقت کا لفظی اظہار ہے۔ آپ کو غیر معمولی خوشی ہو تو آپ بے اختیارانہ طور پر ہنس پڑتے ہیں۔ آپ کو شدید درد ہو تو بے اختیارانہ طور پر آپ کی زبان سے آہ کا لفظ نکل جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بنے، اس کا سینہ خدا کی عظمت و جلال سے بھر جائے گا، اس کی روح خدا کے کمالات کے احساس میں نہا اٹھے گی۔ اور جب ایسا ہوگا تو بے اختیارانہ طور پر خدا کی یاد کے کلمات بھی اس کی زبان سے نکلنے لگیں گے۔ انھیں یاد کے کلمات کا نام ذکر ہے۔

جو شخص واقعۃً خدا کو پالے، اس سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم خدا کا ذکر کرو۔ ایسے شخص کے لیے تو ذکر ایک بے اختیارانہ عمل بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کو ہر مشاہدہ میں خدا کا جلال و کمال دکھائی دے گا۔ ہر تجربہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے گا۔ اس کا سینہ خدا کے احسانات کے احساس سے سرشار ہو جائے گا۔ اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کے بارہ میں خاموش رہے۔

خدا کی معرفت آدمی کے اندر ایک ربانی ہستی پیدا کرتی ہے۔ انسان کے اندر کی یہ ربانی ہستی جب لفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو اسی کا نام ذکر ہے۔

ذکر بمعنی یاد وہ سب سے بڑا نذرانہ ہے جو کوئی بندہ اپنے رب کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ آدمی جب اپنی عبدیت کو اور اس کے مقابلہ میں خدا کی ربوبیت کو سوچتا ہے تو وہ خدا کی عظمتوں کے احساس کے نیچے دب جاتا ہے۔ خدا کے ان گنت احسانات کو سوچ کر وہ حیران رہ جاتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں جو میں اپنے مہربان اور قادر مطلق خدا کو پیش کروں۔ یہ احساسات کچھ روحانی کلمات کی صورت میں اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، انھیں کلمات کا نام ذکر ہے۔

دلیل کی سطح پر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کا مضمون کھول کھول کر بیان کیا ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی کیے جا رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دو یا تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جائے۔ پھر تم اس باغ کے بیچ میں خوب نہریں جاری کر دو۔ یا جیسا کہ تم کہتے ہو، ہمارے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دو یا اللہ اور فرشتوں کو لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دو یا تمہارے پاس سونے کا کوئی گھر ہو جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہ مانیں گے جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جس کو ہم پڑھیں۔ کہو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی اور چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ وہ اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ کہو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا، دیکھنے والا ہے۔ اللہ جس کو راہ دکھائے وہی راہ پانے والا ہے۔ اور جس کو وہ بے راہ کر دے تو تم ان کے لیے اللہ کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔ اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (بنی اسرائیل ۸۹ - ۹۷)

ہر زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ لوگوں نے حق کے داعی کی بات کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی حق کا داعی اٹھتا ہے تو بظاہر وہ صرف ایک "بشر" ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس لیے لوگ اس کو ایک عام آدمی سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

حق ہمیشہ دلیل کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے نہ کہ ظاہری عظمتوں کی سطح پر۔ جو لوگ حق کو دلیل کی سطح پر نہ پائیں وہ اللہ کی نظر میں اندھے اور بہرے ہیں۔ آخرت میں ان کی اندرونی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ وہاں وہ اس حال میں اٹھیں گے کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے ہوں گے اور کان رکھتے ہوئے بہرے۔

دو ہجرتیں

۱۹۲۰ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ نے ہجرت کا فتویٰ دیا تھا۔ اخبار اہل حدیث امرتسر کے شمارہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۰ میں یہ فتویٰ ان الفاظ میں چھپا تھا:

"تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمۂ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کے لئے بجز ہجرت کوئی چارۂ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندستان سے ہجرت کر جائیں۔"

(تحریک خلافت، از قاضی محمد عدیل عباسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۲، صفحہ ۱۳۲)

اس فتوے کے مطابق بہت سے مسلمان ہندستان سے ہجرت کر کے افغانستان گئے۔ یہ سفر ان کے لئے سفر ہجرت کے بجائے سفر بربادی بن گیا۔ بے پناہ تباہی کے بعد کچھ لوگ مر گئے۔ کچھ لوگ مایوسی اور دل شکستگی کے ساتھ واپس آ گئے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی)

مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علماء نے ہجرت کا یہ فتویٰ کیوں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ میں علماء نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ ساٹھ سال سے زیادہ مدت کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ جہاد یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ان علماء نے سمجھا کہ جہاد کے عمل کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے اب انھیں ہجرت کر کے پڑوس کے مسلم ملک میں چلا جانا چاہئے اور وہاں سے مدد حاصل کر کے اور مزید تیاری کر کے دوبارہ ہندستان پر حملہ کرنا چاہئے۔ اس طرح انگریزوں کو یہاں سے نکالنا آسان ہو جائیگا۔

یہ ان علماء کی اجتہادی غلطی تھی۔ یہ اجتہادی غلطی ان سے اس لئے ہوئی کہ انھیں "ہجرت" کے لفظ سے ایک ہی قسم کی ہجرت کا علم تھا۔ یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت۔ انھیں ایک اور ہجرت کا پتہ نہیں تھا، صرف اس لئے کہ اس کا نام قدیم کتابوں میں ہجرت کے بجائے حدیبیہ لکھا ہوا ہے۔

ہجرت کے لفظی معنی چھوڑنے کے ہیں۔ یعنی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو لے لینا۔ یہ ہجرت ایک اہم اسلامی تعلیم ہے۔ مگر ہجرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مکانی ہجرت اور دوسرے تدبیری ہجرت۔

مکہ سے مدینہ جانا یہ مکانی ہجرت تھی اور حدیبیہ کا معاہدہ تدبیری ہجرت تھی۔ کیوں کہ اس معاہدہ میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اب تک دونوں فریقوں کے درمیان جو جنگ جاری تھی اس کو بند کر دیا جائے۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرے۔ اس طرح حدیبیہ نے میدانِ عمل کو بدل دیا۔

گویا کہ صلح حدیبیہ متشددانہ عمل (violent activism) سے غیر متشددانہ عمل (non-violent activism) کی طرف ہجرت تھی۔ اس صلح کے ذریعہ فریق ثانی کو عدم جارحیت کا پابند کر دیا گیا اور اس طرح اہلِ اسلام کے لئے پر امن دعوت یا غیر متشددانہ عمل کا راستہ کھل گیا۔

عجیب بات ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے علماء کی سمجھ میں یہ دوسری ہجرت نہ آسکی۔ البتہ مہاتما گاندھی نے اس راز کو پالیا جنھوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ میں جب کہ علما مسلمانوں کو ہجرت مکانی کی دعوت دے رہے تھے، عین اسی وقت گاندھی جی نے اہلِ وطن کو ہجرت تدبیری کا پیغام دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک ہم تشدد کے ذریعہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد چلا رہے تھے۔ یہ طریقہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ اب ہم کو تشدد کا طریقہ چھوڑ کر عدم تشدد کے طریقہ پر اپنی تحریک کو چلانا چاہئے۔

عدم تشدد کے ہتھیار سے مراد تھا دلیل کا ہتھیار۔ یہ دوسرا ہتھیار ہندستانیوں کے حق میں نہایت مؤثر ثابت ہوا۔ تشدد کے طریقہ میں انگریزی حکومت زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہی تھی۔ اور ہندستانی لوگ اس کے مقابلہ میں کمزور فریق بنے ہوئے تھے۔ مگر جب عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا گیا تو اچانک ہندستانیوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ کیوں کہ اب مقابلہ ہتھیار کے میدان کے بجائے نظریات کے میدان میں منتقل ہو گیا۔

مشینی انقلاب نے انگریزوں کو زیادہ بہتر ہتھیار دے دئے تھے۔ مگر دلیل اور نظریہ کے میدان میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس دوسرے میدان میں انگریزوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ باہر کے دیش سے آکر کیوں ہندستان میں حکومت کریں۔ جب کہ ہندستانی لیڈروں کے پاس یہ مضبوط دلیل تھی کہ ہم اس ملک کے باشندے ہیں۔ اس لئے دنیا بھر

کے مسلّمہ اصول کے مطابق ہم کو حق ہے کہ ہم اپنے ملک میں اپنی مرضی کی حکومت بنائیں۔ انگریز کے پاس نظریۂ استعمار تھا اور گاندھی کے پاس نظریۂ خود اختیاری۔ پہلے کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ واضح طور پر برتر ثابت ہوا۔ اور انگریز کو یہاں سے نکل جانا پڑا۔

یہ ہجرت تدبیری مہاتما گاندھی کی سمجھ میں آئی مگر وہ علماء اسلام کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۲۰ کے پہلے کے دور میں آزادیٔ ہند کی تحریک میں علماء سیاسی امام کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مگر ۱۹۲۰ کے بعد کے دور میں اچانک وہ مقتدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ بعد کے دور میں مولانا محمود حسن صاحب سے لے کر مولانا آزاد تک تمام علماء نے مہاتما گاندھی کو اپنا سیاسی قائد تسلیم کرلیا۔

آج دوبارہ یہی صورتحال ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کے کچھ نادان دوست مسلمانوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ "مسلم کش" فسادات سے نجات کا واحد راستہ ہجرت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک میں سازش کے تحت فرقہ وارانہ فساد کرایا جاتا ہے۔ مسلمان اگر ان فسادات میں دفاع کے اصول کے تحت مقابلہ کرتے ہیں تو عددی فرق کی بنا پر مسلمانوں کا دفاع غیر موثر ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کے اصولِ ہجرت کے تحت مسلمانوں کو اپنے مقامات سے ہجرت کرنا چاہئے۔ اس سے ان کی مراد داخلی ہجرت ہے۔ یعنی مسلمان ملک کے اندر اپنے علیحدہ پاکٹ بنائیں اور منتشر آبادیوں سے نکل کر ان مخصوص علاقوں میں آباد ہو جائیں۔ ایک صاحب لکھتے ہیں:

"ہندستانی مسلمانوں کی بے وقعتی کا راز، باوجود ۲۰ کروڑ آبادی کے یہ ہے کہ وہ گاؤں گاؤں اور شہر بہ شہر پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنی عددی قوت بڑھانے اور اکثریت میں تبدیل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہجرت کر کے بعض پہلے سے طے شدہ علاقوں میں منتقل ہو جائیں یعنی مسلمان ملک کے اندر ہی نقل مکان کریں۔ جہاں مسلمانوں کا تناسب آبادی کم ہے، ان علاقوں کو غیر محفوظ قرار دے کر محفوظ علاقوں کی طرف ہجرت کر جائیں (افکار ملی۔ دہلی، مارچ ۱۹۹۴، صفحہ ۶۲)

یہ اسی نادانی کا اعادہ ہے جو ۷۵ سال پہلے کی گئی تھی۔ اس قسم ہجرت بلاشبہ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

یہ ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں

کرتے ہیں وہ فکر کے اعتبار سے ابھی تک قبائلی دور میں جی رہے ہیں۔ قبائلی دور میں جب کوئی مقابلہ پیش آتا تھا تو وہ صرف دو فریقوں کے درمیان ہوتا تھا۔ مثلاً قدیم یثرب کی جنگ بعاث اوس اور خزرج کے درمیان تھی۔ مگر آج ہم منظم اسٹیٹ کے دور میں جی رہے ہیں۔ اب یہاں دو لڑنے والے فریقوں کے علاوہ ایک تیسرا فریق بھی ہے، اور وہ پولیس ہے۔

مذکورہ انداز میں سوچنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم مسلمانوں کا علیحدہ پاکٹ بنا دیں گے تو ہم اس پوزیشن میں ہو جائیں گے کہ "ہندو حملہ آوروں" کا اجتماعی قوت سے دفاع کر سکیں۔ مگر یہ محض خام خیالی ہے۔ کیوں کہ تیسرا فریق (مسلح پولیس) ایسے موقع پر غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ وہ فوراً آجائے گا اور کرفیو کا قانون نافذ کر کے پورے علاقہ کو اپنے کنٹرول میں لے لے گا۔ اس کے بعد یہ تیسرا فریق وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ کرے گا جس سے بچنے کے لئے مسلم دانشور مسلمانوں کا علیحدہ پاکٹ بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

اسلام کی رو سے وہ اس لئے غلط ہے کہ اسلام میں ہجرت صرف اس وقت ہے جب کہ ہجرت کے سوا کوئی چارۂ کار سرے سے ممکن ہی نہ رہا ہو۔ ہندستان میں ایسی صورت ہرگز پائی نہیں جاتی۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فساد کا بالکل یقینی حل یہ ہے کہ مسلمان اعراض کا اصول اختیار کریں، وہ اشتعال انگیزی کے مواقع پر مشتعل نہ ہوں۔ سیکڑوں کی تعداد میں ایسے تجربات موجود ہیں کہ جب بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا تو فساد نہیں ہوا۔ الرسالہ میں ہم ایسے بہت سے واقعات شائع کر چکے ہیں۔ ایسی حالت میں انتقال آبادی کی بات کرنا اصولِ اسلام کی خلاف ورزی ہے نہ کہ اصول اسلام کی تعمیل۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ کو جب بھی دو میں سے ایک صورت کو اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت کو اختیار فرماتے تھے (ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین إلا اختار ایسرھما)

اس سنت رسول کی روشنی میں دیکھئے تو ہجرت کی مذکورہ تجویز سراسر سنت رسول کے خلاف ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ کا طریقہ انتخاب الیسر (easier option) کا ہے۔ اور یہ نادان لوگ مسلمانوں کو انتخاب اعسر (harder option) کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اس معاملہ میں

اعراض بلاشبہ آسان ہے اور ہجرت اس کے مقابلہ میں بلاشبہ مشکل۔

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا، فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کے لئے ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک اعراض کا اور دوسرے ہجرت کا۔ عقل اور تجربہ دونوں بتاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کو اعراض کے ذریعہ بخوبی طور پر حل کیا جاسکتا ہے۔ پھر جو مسئلہ اعراض کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہو، اس کے لئے ہجرت کی تجویز پیش کرنا کس قدر لغو اور کتنا زیادہ غیر اسلامی ہے۔

موجودہ مسلمانوں کو بلاشبہ ایک ہجرت کرنا ہے۔ مگر یہ مکانی ہجرت نہیں ہے بلکہ تدبیری ہجرت ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد سے اب تک مسلمان، کچھ نا اہل لیڈروں کے مشورہ کے تحت جس اصول پر عمل کر رہے تھے وہ تھا ــــ احتجاج، دفاع، مظاہرہ، ٹکراؤ۔ اب انھیں چاہئے کہ اس طریقہ کو وہ مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ اس کے بجائے وہ محبت، اخلاق، تحمل، اعراض اور حکمت کا طریقہ اختیار کریں۔ یہ ان کے لئے تدبیری ہجرت یا طریق کار میں ہجرت کے ہم معنی ہے۔ اور اسی میں ان کی یقینی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

ہجرت وصل کی ضد ہے۔ اس کا مطلب ہے ترک (چھوڑنا) مثلاً برائی کو چھوڑ کر بھلائی اختیار کرنا ہجرت ہے۔ ایک مقام کو ناموافق پاکر دوسرے مقام کی طرف جانا ہجرت ہے۔ اسی طرح اجتماعی معاملہ میں ایک تدبیر کو غیر مفید پاکر دوسری تدبیر کو اختیار کرنا بھی ہجرت ہے۔

یہ آخری ہجرت موجودہ زمانہ میں نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہوگئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمان ٹکراؤ کو اپنی پالیسی بنائے ہوئے ہیں۔ اس کو چھوڑ کر انھیں صبر کو اپنی ملی پالیسی بنانا چاہیے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں پر صبر کرتے ہوئے وہ مثبت عمل کے میدان میں اپنی کوششوں کو لگادیں۔ اسی کا نام صبر ہے، اور اسی صبر میں ان کی ترقی اور کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

ایک اہم کردار

اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ میں ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ خندق (۵ھ) کہا جاتا ہے۔ اس میں مخالف قبائل کے ۱۲ ہزار آدمی مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ قرآن میں اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ــــ جبکہ وہ تم پر چڑھ آئے، تمہارے اوپر کی طرف سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے۔ اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے امتحان میں ڈالے گئے اور بالکل ہلا دئے گئے (الاحزاب ۹-۱۱)

اس نازک وقت میں مدینہ کے ایک شخص نے مسلمانوں کے حق میں نہایت اہم رول ادا کیا تھا۔ اس نے حسنِ تدبیر کے ذریعہ ہونے والی خونی جنگ کو ٹال دیا تھا۔ اس آدمی کو آجکل کی زبان میں درمیانی (intermediary) شخص کہا جاسکتا ہے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلۂ غطفان کے ایک آدمی نعیم بن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ مگر میری قوم میرے اسلام سے ابھی واقف نہیں (اس طرح میں اب بھی ان میں معتمد علیہ شخص ہوں) آپ مجھ سے کوئی کام لینا چاہیں تو حکم فرمائیں۔ میں اس کو انجام دوں گا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعیم بن مسعود پر شبہ کرتے۔ ان کو واپس کر دیتے اور مسلمانوں سے کہتے کہ ان سے دور رہو۔ یہ ہمارے دشمنوں کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بجائے آپ اس کی بات سن کر خوش ہو گئے اور فرمایا کہ بے شک تم ہی ہمارے اندر ایک ایسے آدمی ہو (انما انت فينا رجل واحد) سیرۃ ابن ہشام ۳/۲۴۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعیم بن مسعود کی قدر دانی کی۔ ان کے حق میں دعا کی اور ان کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ کو ٹالنے کے لئے استعمال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی سنتوں میں سے یہ بھی ایک سنت ہے کہ درمیانی آدمی پر بھروسہ کیا جائے۔ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اس کو اسلام اور مسلمانوں کے بہترین مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

مسلمانوں میں جب تک اسلام کی اعلیٰ اسپرٹ زندہ تھی تو اس سنت پر عمل بھی ہوتا رہا۔ مثلاً بنوامیہ کے زمانہ میں رجاء بن حَیوَۃ اسی قسم کے ایک درمیانی شخص تھے۔ ان کے ذریعہ مسلمانوں کو عمر بن عبد العزیز جیسا عادل خلیفہ ملا۔ بنوعباس کے زمانہ میں امام ابو یوسف اسی قسم کے ایک درمیانی شخص تھے۔ ان کے ذریعہ فقہ اسلامی کی ترقی میں زبردست مدد ملی۔ مغلیہ دور میں مجدد الف ثانی نے یہی درمیانی رول ادا کیا اور اسی باہمی اعتماد کی بنا پر ان کے لئے ممکن ہوا کہ وہ دین الٰہی کے فتنہ سے اس وقت کے مسلمانوں کو نجات دلائیں۔ وغیرہ۔

مگر موجودہ زمانہ میں زوال کے نتیجہ میں مسلمانوں میں شکست خوردہ نفسیات پیدا ہوگئی۔ وہ اس قسم کے "درمیانی" افراد کو غیر ضروری طور پر شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہ مظہر اتنا عام ہے کہ اس کو ساری مسلم دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں ہر مسلم ملک میں مسلمانوں کے اندر ایک طبقہ پیدا ہوا جس کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی تعلیمی اہلیت کی بنا پر حکومتی نظام میں لئے گئے۔ اور اس طرح انھیں حکمراں طبقہ سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ یہ لوگ مسلم عوام اور حکمراں طبقہ کے بیچ میں "درمیانی گروہ" کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک طرف وہ مسلمان ہونے کی بنا پر مسلمانوں سے جڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف وہ حکمراں طبقہ کا اعتماد حاصل کئے ہوئے تھے۔ مسلمان ایسے لوگوں سے بہت فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ساری دنیا میں ایسے لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ان میں کچھ لوگوں کو دنیا پرست اور منافق قرار دیا گیا اور کچھ لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ بہترین مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

ہندستان میں بھی یہی غیر مطلوب صورت پیش آئی۔ مثلاً سر سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸) مسلمانوں اور برطانی حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت قیمتی شخص تھے۔ مگر معاصر مسلمانوں نے ان کو استعمار کا پٹھو کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ جسٹس امیر علی (۱۸۴۹-۱۹۲۸) بھی اسی طرح ایک مفید درمیانی شخص تھے۔ مگر معاصر مسلمانوں نے ان پر شبہ کیا اور ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ مولانا آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸) کانگرس کے واسطہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین درمیانی شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ان کو شوبوائے کہہ کر رد کر دیا گیا۔

موجودہ زمانہ کے ہندستان میں اس طرح کے بہت سے قیمتی افراد تھے جو اپنے حالات کی بنا پر اکثریت اور اقلیت کے درمیان کامیاب طور پر درمیانی شخص کا رول کر سکتے تھے۔ مگر مسلمانوں کی اسی غیر ضروری حساسیت کی بنا پر وہ مسلمانوں کے درمیان اعتماد حاصل نہ کر سکے اور نتیجۃً وہ مسلمانوں کے حق میں اپنی ممکن خدمات انجام دینے سے قاصر رہے۔ مثلاً ڈاکٹر سید محمود، فخرالدین علی احمد، علی یاور جنگ، وغیرہ وغیرہ۔

اس سلسلہ کی مزید نامعقول روش وہ ہے جس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بے بنیاد تفریق کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں اور انگریزوں کے مابین درمیانی شخص بنے تو ان کو مسلمانوں کے درمیان خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے برعکس مولانا حسین احمد مدنی جیسا مخلص عالم مسلمانوں میں غیر مقبول ہو گیا، کیوں کہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین درمیانی شخص بنا تھا۔

یہی غلط روایت آج بھی باقی ہے۔ چنانچہ موجودہ ہندستان میں ایک مثال مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں دوسری مثال مولانا سید اسعد مدنی کی ہے۔ دونوں ایک اعتبار سے درمیانی شخص کا رول ادا کر رہے ہیں۔ مگر مولانا علی میاں مسلمانوں کے درمیان نیک نام ہیں اور مولانا اسعد مدنی مسلمانوں کے درمیان بدنام۔

مولانا علی میاں ایک اعتبار سے گویا ہندستانی مسلمانوں اور عرب کے درمیان کے آدمی ہیں۔ اور مولانا اسعد مدنی ایک اعتبار سے گویا مسلمانوں اور حکومت ہند کے درمیان کے آدمی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ مولانا علی میاں عرب کی خرابیوں پر چشم پوشی کرتے ہیں، جب کہ مولانا اسعد مدنی ایسا نہیں کرتے۔ مثلاً ہندستان میں بابری مسجد ڈھائی گئی تو مولانا اسعد مدنی نے کھل کر اس کے خلاف احتجاج کیا۔ دوسری طرف عرب میں بھی متعدد مسجدیں ڈھائی گئیں مگر مولانا علی میاں نے کبھی اس کے خلاف کوئی مذمتی بیان نہیں چھپوایا اور نہ اس کے خلاف کوئی احتجاجی تقریر کی۔ اس کے باوجود مولانا علی میاں مسلمانوں کی گڈ بک پر ہیں اور مولانا اسعد مدنی مسلمانوں کی گڈ بک پر نہیں۔ اس تفریق کا سبب نہ عقل ہے اور نہ اسلام۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مسلمان ایک معاملہ میں حساس ہیں اور اسی قسم کے دوسرے معاملہ میں غیر حساس۔

درمیانی افراد ایک اجتماعی ضرورت ہیں۔ ان کا رول ہر سماج میں نہایت اہم ہے۔ چنانچہ اس قسم کے لوگ ایک ملک کی طرف سے دوسرے ملک میں سفیر بنائے جاتے ہیں۔ اسی قسم کے افراد تجارتی کمپنیوں اور حکومت کے درمیان واسطہ کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح یہ درمیانی افراد بلاشبہ ہمارا بہترین سرمایہ ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کے لئے نہایت مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ایسے افراد مسلمانوں کے درمیان اپنی نیک نامی نہ کھوئیں۔ انھیں مسلمانوں کا بھرپور اعتماد حاصل رہے۔

"درمیانی افراد" پر شبہ کرنے کا سبب ہمیشہ ایسی معمولی باتیں ہوتی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ مثلاً انگریزوں کے زمانہ میں کوئی شخص نکٹائی کا استعمال کرتا ہوا نظر آیا تو فوراً اس کو تہذیبی مرتد قرار دے کر اس کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ موجودہ زمانہ میں کسی شخص نے بغیر ٹونٹی کا لوٹا استعمال کیا تو فوراً شبہ کر لیا گیا کہ وہ ہندو تہذیب سے متاثر ہے۔ کسی شخص نے کھدر کے کپڑے پہن لئے تو سمجھ لیا گیا کہ وہ کانگرس کا ایجنٹ ہے، وغیرہ۔

اس قسم کی غیر ضروری حساسیت سے مسلمانوں کو اپنے آپ کو بچانا ہوگا۔ ان کو اس قسم کی غیر معقول اور غیر متوازن روش کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ ورنہ شدید اندیشہ ہے کہ ملّی ترقی کا منصوبہ اپنی تکمیل کی منزل تک نہ پہنچے، وہ ہمیشہ کے لئے محض ایک خواب بن کر رہ جائے۔

مطالعۂ سیرت

الرسالہ ماہ اگست ۱۹۹۴ کا شمارہ اِن شاء اللہ سیرت نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ اس کا نام "مطالعۂ سیرت" ہوگا۔ اصحابِ ایجنسی مزید مطلوبہ تعداد سے فوری طور پر مطلع فرمائیں۔

منیجر الرسالہ منتھلی

داعیانہ عمل، داعیانہ رویہ

ایک دکان دار وہ ہے جو دکان کھولنے کے بعد ہر طرف اس کا اعلان بھی کرے۔ اخبار، ریڈیو، ٹیلی وژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرکے اس کو پوری آبادی میں مشتہر کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرا دکان دار وہ ہے جو دکان کھولنے کے بعد اس کا اشتہار تو نہ کرے، البتہ اپنی دکان میں دکاندار کی طرح رہے۔ وہ اپنی دکان میں صحیح سامان رکھے، لوگوں سے میٹھا بول بولے۔ لین دین میں کسی کو شکایت کا موقع نہ دے۔

پہلا دکان دار بلاشبہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ وہ اپنی تجارت کو توسیعی تجارت بنا دے گا۔ مگر دوسرا دکان دار بھی اپنی تجارت کو نفع بخش بنانے میں کامیاب رہے گا۔ پہلا دکان دار اگر "کروروں" روپیہ کمائے گا تو دوسرا دکان دار بھی "لاکھوں" روپیہ حاصل کرلے گا۔ پہلے اور دوسرے میں صرف مقدار کا فرق ہوگا نہ کہ نوعیت کا۔

اسی مثال سے اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان پورے معنوں میں داعی بن کر رہیں۔ وہ منصوبہ بند انداز میں دوسری قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچائیں۔ وہ دین اسلام کے باقاعدہ مبلغ بن جائیں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو یہ ان کے لیے بہت بڑے فضل کی بات ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو کسی گروہ کو دنیا اور آخرت میں سب سے بڑے انعام کا مستحق بناتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان باقاعدہ اور براہ راست انداز میں دعوتی جدوجہد نہ کریں۔ تاہم وہ اپنی ذاتی اور جماعتی زندگی میں داعیانہ رویہ اختیار کریں۔ وہ دوسری قوموں کو حریف سمجھنے کے بجائے مدعو سمجھیں۔ وہ اللہ سے لوگوں کی ہدایت کے طالب ہوں۔ غیر مسلم افراد سے تعلقات کے دوران اسلامی اخلاق کا لحاظ رکھیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تو اس کو برداشت کرلیں۔ ہر اس کارروائی سے اپنے آپ کو بچائیں جو غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان کھنچاؤ اور نفرت پیدا کرنے والی ہو۔ مسلمان اگر یہ دوسرا رویہ اختیار کریں تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں رحمت اور انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ باقاعدہ اور منظم انداز میں تبلیغ کا کام زیادہ تر مکہ کے ۱۳ سالہ دور میں ہوا۔ تاہم اسلام ہر زمانہ میں تیزی سے پھیلتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خواہ براہ راست داعیانہ عمل نہ کریں، تاہم وہ داعیانہ رویہ پر ہمیشہ قائم رہے۔ یہی خاص سبب ہے جس کی بنا پر اسلام کے پھیلنے کا سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں رکے بغیر جاری رہا۔

سیاسی اخلاقیات

۱۹۳۰ میں ہندستان میں مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں جواہر لال نہرو گرفتار کرکے جیل بھیج دیئے گیے۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کی اہلیہ کملا نہرو الہ آباد کانگریس کمیٹی کی صدر مقرر ہوئیں۔ بی۔ ایس۔ پانڈے ان کے سکریٹری تھے۔

مسٹر پانڈے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ کملا نہرو جب سٹی کانگریس کی صدر ہوئیں تو انھوں نے پرجوش طور پر کام کرنا شروع کیا۔ بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر پکٹنگ کے لیے انھوں نے نئی نئی خواتین کی بھرتی کی۔ انھیں میں سے ایک لال بہادر شاستری کی اہلیہ للتا شاستری بھی تھیں۔ مسٹر پانڈے لکھتے ہیں کہ جب میں پکٹنگ کے مقام پر پہونچا تو میں نے دیکھا کہ للتا شاستری نے اپنی کلائیاں زخمی کرلی ہیں۔ اور ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں۔ میں سکتے میں آگیا۔ کملا نہرو نے بڑے فخر کے ساتھ اس نئی شرمیلی خاتون رضاکار کی بہادری کا قصہ بیان کیا۔ للتا شاستری ایک گاہک سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہی تھیں کہ وہ بدیسی کپڑا نہ خریدے۔ اس پر دکان دار نے برجستہ کہا "بہن جی! آپ ولایتی کپڑا خریدنے کو منع کر رہی ہیں، مگر آپ نے جو چوڑیاں پہن رکھی ہیں یہ بھی تو ولایتی ہیں"۔ للتا شاستری حیرت سے بولیں "اچھا؟"

دکان دار: "ہاں بہن جی! یہ چوڑیاں ولایتی ہیں!"

للتا جی نے دکان دار کے اس جملہ کو دہرایا۔ پھر دکان دار کے ہاتھ سے آہنی گز لے کر اپنی ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں اور ہاتھ جوڑ کر دوبارہ اس خاتون گاہک سے درخواست کی کہ وہ ولایتی کپڑا نہ خریدے اور دکاندار سے کہا کہ وہ ولایتی کپڑا نہ فروخت کریں۔ اس اچانک عمل پر گاہک اور دکان دار گم سم رہ گیے۔ پڑوس کے تمام دکاندار نادم ہو گیے اور اس کے بعد انھوں نے اپنی دکانیں فوراً بند کر دیں۔ (قومی آواز ۶ مئی ۱۹۸۵)

ساٹھ سال پہلے کانگریس کارکنوں کا یہ جوش محض ایک سیاسی تحریک کا جوش تھا نہ کہ حق و صداقت کا جوش۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں آزادی ملنے کے بعد انھیں کانگریسیوں کی اولادوں کی سب سے بڑی خواہش یہ بن گئی کہ اپنے گھروں کو بدیشی سامانوں سے بھرلیں ——— تحریکی اور سیاسی جوش کی یہ قسم مسلم جماعتوں میں بھی بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔

صحیح طریقہ

شاہ عبدالرحیم صاحب شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد بھی تھے اور ان کے استاد اور شیخ اور مربی بھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی نوجوانی کی عمر میں ایک بار کچھ لوگوں کے ساتھ ایک باغ کی سیر کے لیے گئے۔ جب واپس آئے تو والد صاحب نے فرمایا کہ ولی اللہ، تم نے اِس دن رات میں وہ کیا حاصل کیا جو باقی رہے۔ ہم نے تو اس مدت میں اتنا درود شریف پڑھا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرا دل باغ کی سیر سے بالکل ہٹ گیا۔ اس کے بعد پھر اس کا شوق پیدا نہیں ہوا (تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، صفحہ ۱۰۲)

قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں خدا کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں، ان پر غور کرو۔ شاہ ولی اللہ صاحب شہر کے باہر ایک باغ میں گئے۔ وہاں وہ غالباً ۲۴ گھنٹے تک رہے۔ اس قسم کا ایک باغ خدا کی نشانیوں کا چمنستان ہوتا ہے۔ وہاں چاروں طرف خدا کی تجلیات بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں شاہ صاحب کے والد (شاہ عبدالرحیم صاحب) کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم خدا کی نشانیوں کی دنیا میں گئے تھے۔ وہاں تم نے کیا کیا نشانیاں دیکھیں۔ خدائی معرفت کے کون سے تجربات وہاں تم کو حاصل ہوئے۔

مگر شاہ عبدالرحیم صاحب "سلوک" کے اس قرآنی طریقہ سے واقف نہ تھے۔ وہ صرف صوفیاء کے ایجاد کردہ سلوک کو جانتے تھے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ایک ہزار بار درود، ایک ہزار بار نفی اثبات، بارہ ہزار بار اسم ذات کا ورد کرتے تھے (صفحہ ۸۷) ایسی حالت میں وہ شاہ ولی اللہ صاحب کو وہی رہنمائی دے سکتے تھے جو انھوں نے دیا۔

صوفیاء کے درمیان ذکر اور اوراد و وظائف کے نام سے اس قسم کا جو طریقہ رائج ہوا، وہ بلاشبہ بدعت تھا۔ قرآن و سنت کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے جلال و کمال پر غور کرے۔ وہ کائنات میں بکھری ہوئی آیات (نشانیوں) میں اپنے رب کی جھلکیاں دیکھے۔ وہ احتساب کے ذریعہ اپنے ذہن کو دنیا سے ہٹا کر آخرت کی فکر میں لگائے۔ ذکر ایک ذہنی عمل ہے نہ کہ تکرار لسان۔ ذکر یادِ الٰہی میں ڈوبنا ہے نہ کہ لفظ اللہ کا ورد کرنا۔ ذکر خدا کی عظمتوں کو پانا ہے نہ کہ خدا کے اسم کا شمار کرنا۔

تعمیرِ حیات

کسی کا قول ہے : ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے، سوا اس مسئلہ کے جس کو ناقابل حل سمجھ لیا جائے۔ یہ بہت بامعنی قول ہے۔ اس کا تعلق انسان کے ہر معاملہ سے ہے، خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا کوئی بڑا معاملہ۔ خواہ وہ ایک شخص کا معاملہ ہو یا پوری قوم اور پورے ملک کا معاملہ۔

انسان کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا ہے تو عام طور پر اس کو مسئلہ کا ایک ہی پہلو دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ اس مسئلہ کا مشکل ہونا ہے، مسئلہ کا آسان پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو صرف مشکل ہی مشکل ہو۔ اس میں آسانی کا پہلو موجود نہ ہو۔ مسئلہ پیش آنے کے بعد آدمی اگر گہرائی کے ساتھ سوچے تو اس کو نظر آئے گا کہ جہاں مشکل تھی وہیں آسانی کی صورتیں بھی اس کے لیے موجود تھیں۔ جہاں ناموافق پہلے تھے، وہیں کچھ موافق پہلو بھی تھے جو اس انتظار میں تھے کہ کوئی آئے اور ان کو استعمال کرے۔

ایک صاحب نے ایک شخص کی شرکت میں ایک کاروبار کیا۔ کاروبار میں اچھا نفع ہوا۔ اس کے بعد شریک کی نیت بگڑ گئی۔ اس نے کچھ غلط تدبیر کر کے پورے کاروبار پر قبضہ کر لیا۔ اور دوسرے صاحب کو اس سے الگ کر دیا۔ پہلے دونوں کی حیثیت برابر کے شریک کی تھی۔ اب یہ صورت بن گئی کہ ایک شخص تنہا پورے کاروبار کا مالک ہے، اور دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بہت غصہ میں تھے اور اتنا مایوس تھے کہ خودکشی کر لینا چاہتے تھے، میں نے کہا کہ آپ کے پاس دو چیزیں تھیں۔ ایک کاروبار، اور دوسرے آپ کا اپنا وجود۔ کاروبار اگر آپ سے کھو گیا تو اس کے لیے اتنا غم کرنے کی کیا ضرورت۔ آپ کا اپنا وجود تو پھر بھی بدستور آپ کے پاس باقی ہے۔ آپ اپنے اس باقی سرمایہ کو استعمال کیجئے، آپ پہلی چیز سے اپنی نظریں ہٹا لیجئے اور اپنی ساری توجہ دوسری چیز پر لگا لیجئے۔ اللہ کی مدد سے یقیناً آپ کامیاب رہیں گے۔

یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انھوں نے پچھلے کاروبار کو بھلا دیا اور ازسرِنو ایک نیا کاروبار شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنی عقل اور محنت کو استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ان کا کاروبار چل گیا۔ چند سال کے بعد وہ اس شخص سے بھی آگے بڑھ گئے جس نے دھوکا دے کر پچھلے کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہ آدمی جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اور انھوں نے اپنی محنت سے ترقی کا برتر مقام حاصل کرلیا۔

یہی اس دنیا میں زندگی اور ترقی کا راز ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو اس احساس کے ساتھ زندگی گزارنا ہے کہ یہاں اگر دشواریاں ہیں تو یہاں مواقع بھی ہیں۔ یہاں اگر نقصان ہے تو یہاں فائدہ کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ یہاں اگر دشمن ہیں تو یہاں دوست بھی ہیں۔ یہاں اگر تاریک پہلو ہیں تو اسی کے ساتھ یہاں روشن پہلو بھی ہیں۔ یہاں اگر کھونے کی مثالیں ہیں تو یہاں پانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ یہاں اگر انسان کے لیے "نہیں" ہے تو یہاں اس کے لیے "ہاں" بھی پوری طرح موجود ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ کبھی مایوس نہ ہو۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنا حوصلہ نہ کھوئے۔ وہ ماضی کو بھلاکر ہمیشہ مستقبل کی طرف دیکھے۔ ہر بار گرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرے۔ وہ کسی ہونے والی بات کو کبھی آخری ہونے والی بات نہ قرار دے۔

حوصلہ مندی اس دنیا میں کسی آدمی کا سرمایہ ہے۔ یہ ایسا سرمایہ ہے جو کبھی کھویا جانے والا نہیں۔ حوصلہ مندی بلاشبہ سب سے زیادہ قیمتی دولت ہے، اور حوصلہ مندی وہ دولت ہے جس کو کوئی چھیننے والا چھیننے پر قادر نہیں۔

کسی کا قول ہے: سب کچھ کے پیچھے دوڑنے والا کچھ نہیں پاتا، اور جو آدمی کچھ کے پیچھے دوڑے وہ آخرکار سب کچھ کو پالیتا ہے۔ یہ زندگی کا اہم ترین راز ہے۔ زندگی انھیں لوگوں کے لیے ہے جو اس راز کو سمجھیں اور اس کو عملی طور پر استعمال کریں۔

آپ پھل دار درختوں کا ایک باغ لگانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کریں کہ کہیں سے بڑے بڑے درخت لائیں اور ان کو اپنی زمین پر گاڑ دیں تو اس طرح آپ باغ والے نہیں بن سکتے۔ آج آپ جو درخت لگائیں گے وہ کل سوکھ چکے ہوں گے۔ کل آپ دوسرے درخت لاکر لگائیں گے تو دوبارہ وہ پرسوں تک سوکھ چکے ہوں گے۔ آپ پچاس سال تک بھی ایسا کرتے رہیں تو کبھی آپ ہرے بھرے پیڑوں کے باغ کے مالک نہیں بن سکتے۔

باغ کا مالک بننے کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ اپنے مطلوبہ درخت کے بیج حاصل کریں اور ان کو زمین میں گاڑ دیں۔ اس کے بعد ان کو کھاد اور پانی دیتے رہیں۔ جب آپ ایسا کریں گے تو ضروری مدت گزرنے کے بعد آپ کی زمین پر ہرے بھرے درختوں کا باغ لہلہا رہا ہوگا۔

یہی معاملہ زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔ آپ کو علم میں آگے بڑھنا ہو، یا آپ کو کاروبار کرنا ہو۔ یا آپ کو ایک کارخانہ چلانا ہو، ہر کام میں ترقی حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ شروع سے آغاز کیا جائے۔ کم سے چل کر زیادہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ پہلے صرف جزء پر قناعت کی جائے، اس کے بعد کل کی امید کی جائے۔ موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جو کسی کو ترقی اور کامیابی کے درجہ تک پہنچانے والا ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک آدمی کو کسی دوسرے شخص سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ جو کچھ دینے پر راضی ہوتا ہے وہ پہلے شخص کو کم نظر آتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسرے آدمی سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرلے۔ مگر یہ دانش مندی نہیں۔ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ دونوں آدمیوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو جائے گا اور جو کچھ مل رہا تھا اس کا ملنا بھی مشتبہ ہو جائے گا۔

آدمی کو چاہیے کہ ایسی نادانی نہ کرے۔ دوسرا شخص جو کچھ دینے پر راضی ہے اس کو لے کر اپنی زندگی کی جدوجہد شروع کر دے۔ وہ ملی ہوئی چیز کو زینہ بنا کر نہ ملی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی محنت میں لگ جائے۔ اگر وہ ایسا کرے تو چند سال کے بعد وہ دیکھے گا کہ دوسرا شخص اس کو جو کچھ دینے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مزید اضافہ کے ساتھ اس نے خود اپنی محنت کے ذریعہ حاصل کر لیا ہے۔

آدمی جب کسی نہ ملی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بھول جاتا ہے کہ اس کوشش میں وہ اپنی ملی ہوئی ایک چیز کو ضائع کر رہا ہے۔ یہ ضائع ہونے والی چیز اس کا وہ وقت ہے جو اب بھی اس کو حاصل ہے۔ نہ ملی ہوئی چیز کی خاطر ملی ہوئی چیز کو کھونا عقل مندی نہیں ہو سکتی۔ غیر حاصل شدہ چیز کے پیچھے حاصل شدہ چیز سے محروم ہو جانا کسی سمجھ والے آدمی کا کام نہیں۔

وقت آدمی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ دانش مند وہ ہے جو اپنے وقت کی قدر کرے، جو وقت کے کھونے کو کسی بھی حال میں برداشت نہ کرے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔

بلجیم کا نام سب سے پہلے میں نے تقریباً پچاس سال قبل پوسٹیج اسٹمپ کے ذریعہ جانا۔ اس وقت میں عربی مدرسہ میں طالب علم تھا۔ مجھے ٹکٹ کا شوق ہوگیا۔ میں نے بہت سے ملکوں کے ٹکٹ اپنے البم میں جمع کر لئے۔ انھیں میں سے ایک بلجیم کا ٹکٹ بھی تھا۔ جس پر غالباً شاہ لیوپولڈ سوم (Leopold III) کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ابتدائی عمر میں اکثر ملکوں کے نام میں نے ٹکٹ ہی کے ذریعہ جانے ہیں۔

پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد میرا ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ختم ہوگیا۔ مگر میں نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ وہ ۹۰ سال کی عمر میں بھی بچوں کی طرح ٹکٹ کے شائق تھے۔ اس مثال سے دو قسم کے انسانوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہے کہ ابتداءً وہ جیسا بن گیا، آخر تک وہ اسی طریقہ پر قائم رہتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو ہمیشہ سوچتا رہے۔ جو علم اور عمر کے اضافہ کے بعد سفر حیات کے مزید مراحل طے کرے۔

بلجیم کی تاریخ چھٹی صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ۱۸۳۰ء میں یہاں آزاد بادشاہت قائم ہوئی دونوں عالمی جنگوں کے درمیان جرمنی نے بلجیم پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر دونوں بار جنگ کے بعد اس نے جرمنی کے قبضہ سے رہائی حاصل کر لی۔ انڈیا کے مقابلہ میں بلجیم بہت چھوٹا ہے مگر ترقیات کے اعتبار سے وہ انڈیا سے بہت زیادہ آگے ہے۔

ہندستان میں جب میں لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر آدمی کے چہرہ پر لکھا ہوا ہے "میں قانون کو توڑنے والا ہوں" اس کے برعکس یہاں کے لوگوں پر جب میری نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک کے چہرہ پر لکھا ہوا ہو: "میں قانون کا پالن کرنے والا ہوں" یہاں کے لوگ (جن میں کئی یورپی ملک کے لوگ شامل ہیں) اس طرح چلتے پھرتے اور اپنا کام کرتے ہیں جیسے کسی ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ قانون ان سب کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہو۔ یہاں اگرچہ مکمل آزادی ہے، مگر اسی کے ساتھ یہاں اجتماعی آداب و قوانین کا مکمل احترام پایا جاتا ہے۔ ہندستان کی آبادیوں میں چلئے تو قانون شکنی کی تصویریں نظر آئیں گی۔ اس کے مقابلہ میں یہاں کی آبادیاں ہر طرف قانون کی پابندی کی تصویر بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔

برو سیلز کانفرنس میں ۸۰ ملکوں کے لوگ شریک ہوئے۔ ۱۵ ستمبر کو صبح سے دوپہر تک

کے وقت میں اس کا عام اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس لووین کے اسپورٹ سنٹر کے ہال میں تھا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مختلف مذاہب کے منتخب افراد نے اپنے اپنے مذہب کی روشنی میں مندرجہ ذیل موضوع پر اظہار خیال کیا:

Religions and Solidarity among peoples.

مجھے اس موقع پر ایک پیپر پڑھنا تھا۔ یہ پیپر انگریزی میں تیار کرکے میں نے پیشگی طور پر کانفرنس کے منتظمین کے پاس بھیج دیا تھا۔ مگر کانفرنس کے منتظمین نے بالکل آخر وقت میں کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں عربی زبان میں بھی کچھ کہوں۔ کیوں کہ یہاں قابل لحاظ تعداد میں عرب ہیں اور وہ عربی میں سننا پسند کریں گے۔

میرے پاس بمشکل آدھ گھنٹہ کا وقت تھا۔ منتظمین کے اصرار پر میں راضی ہوگیا۔ ڈائس پر جانے سے پہلے میں ہال کے کنارہ کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور فوری طور پر دو صفحہ عربی زبان میں لکھا۔ اس کے بعد میں ڈائس پر آیا۔ اپنے وقت پر میں نے پہلے عربی میں خطاب کیا۔ اس کے بعد انگریزی مقالہ پیش کیا۔

عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریر، نیز اس کے مضمون کی بنا پر لوگ بہت خوش ہوئے۔ ہندستان کے جسٹس ایچ آر کھنا (ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ) نے مجھ کو الگ کرسی پر بیٹھ کر عربی تقریر تیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اجتماع کے بعد وہ ملے اور کہا:

We are proud to have a scholar like you in India who can deliver an Arabic speech over an international assembly at such a short notice.

بہت سے مسلم اور غیر مسلم صاحبان نے خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک الحافظ صبری کوتشی (مفتی البانیہ) تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Hfz. Sabri Koei, Bashkesia Islamike,
Tirane, Albania (Tel. 70223701)

انھوں نے عربی تقریر کی ایک کاپی طلب کی اور کہا: فضيلة الشيخ، إنني فهمت من كلماتكم التي ألقيتم بين الناس أنكم تدعونهم الى الايمان. و في قلبي وجدت هذا المعنى من كلماتكم الكريمة.

فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔ ایک لبنانی عالم نے کہا: اعجبتنی قراٗتک العربیۃ۔ اس طرح اور کئی لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

ایک مسیحی عالم نے اپنی تقریر میں کہا کہ چرچ اس قسم کی جو کوششیں آج کر رہا ہے، اس کے لئے کیچ ورڈ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے باہمی اعتماد کی بحالی (confidence building) اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو دوبارہ اس کی فطری حالت پر لے آنا۔ فطرت کے مطابق، اصل انسانی حالت یہی ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے زندگی گزاریں۔ لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حسن ظن کے ساتھ معاملہ کریں۔ لوگ ایک دوسرے کے بارہ میں منفی نفسیات کا شکار نہ ہوں۔

اسی فطری حالت پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ زندگی میں ہمیشہ بگاڑ اس وقت آتا ہے جب کہ فطرت کا یہ نقشہ بگڑ جائے۔ جب بھی ایسا ہو تو اصلاح پسند افراد کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے فطری احساسات کو زندہ کریں تاکہ حیات بشری کا نظام دوبارہ اپنی اصل حالت پر قائم ہو جائے۔

برسیلز کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے ایک بار ایک نوجوان سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ روم کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر ۲۳ سال بتائی۔ وہ طالب علم تھے اور ان کا نام فیبو لیبراٹوری (Fabio Liberatori) تھا۔

میں نے پوچھا کہ موجودہ اٹلی میں ارینجڈ میرج (arranged marriage) کا رواج ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں زیادہ تر ارینجڈ میرج کا رواج ہے اور مغربی ملکوں میں زیادہ تر لو میرج (Love marriage) کا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انڈیا میں تفریق کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں، جب کہ مغربی ملکوں میں شادی کے بعد تفریق کا رواج کثرت سے پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ لو میرج اور تفریق دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو لو میرج کہنا صحیح نظر نہیں آتا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ موجودہ قسم کی لو میرج کو ایکیڈنٹل میرج کہنا چاہئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو میری اس رائے سے اتفاق ہے۔ انھوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہا کہ ہاں مجھے آپ کی رائے سے صد فی صد اتفاق ہے۔

اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو کچھ سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کی بدترین مثال موجودہ زمانہ کے "اسلامسٹ" ہیں۔ وہ جگہ جگہ پر تشدد عمل چھیڑے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلامی حکومت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ بربادی کے سوا کسی اور منزل پر پہنچنے والے نہیں۔

الجزائر کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ معلوم ہے، وہاں کے برسراقتدار طبقہ نے انتخابات کو معطل کرکے اسلام پسند جماعت کو اقتدار میں آنے سے روک دیا تھا۔ اب وہاں کی حکومت اور وہاں کے اسلام پسند طبقہ کے درمیان مسلسل کشمکش جاری ہے۔ حکومت اپنی پولیس کو اسلام پسند طبقہ کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اس کے جواب میں اسلام پسند طبقہ یہ کر رہا ہے کہ اس نے ناجائز ہتھیار جمع کر لئے ہیں اور پولیس افسروں یا سرکاری شخصیتوں کو اپنی گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ قاتل اور مقتول دونوں مسلمان ہوتے ہیں۔

مذکورہ الجزائری نے بتایا کہ "اسلامی سیاست" کے ظہور سے پہلے الجزائر ایک بہترین ملک تھا۔ مگر نام نہاد اسلام پسندوں نے الجزائر کو ہر اعتبار سے تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔

آخری اجلاس میں ڈائس پر جو چند افراد تھے، ان میں سے ایک پولینڈ کے کاردینال جوزف گلمپ (Jozef glemp) تھے۔ وہ مسیحی دنیا میں پوپ کے بعد نمبر ۲ کی شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ڈچ زبان میں تقریر کی جس کا ترجمہ میں نے عربی زبان میں سنا جو ایک مسیحی مترجم کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں رجال دین خدا سے دور ہو گئے اس لئے خدا بھی ان سے دور ہو گیا ہے۔

اس کو سن کر میں نے سوچا کہ ایک مسلم عالم بھی اپنی تقریر میں یہی کہتا ہے اور مسیحی عالم بھی یہی کہہ رہا ہے۔ پھر دونوں میں کیا فرق ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے بہت زیادہ قابل توجہ ہے جو صرف اس قسم کے کلمات بولنے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔

۵ ستمبر کی سہ پہر کو دعا (prayer) کا پروگرام تھا۔ تمام لوگ گاڑیوں کے ذریعہ ایک مقام پر لے جائے گئے۔ وہاں سے تقریباً ایک کیلو میٹر کا سفر پیدل طے کیا گیا۔ سڑک کے دونوں طرف مقامی لوگ کھڑے ہوئے تالیوں کے ذریعہ شرکاء کانفرنس کا استقبال کر رہے تھے۔

اگلے مقام پر ہر مذہب والوں کے لئے الگ الگ عبادت گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اہل اسلام کے لئے ایک بڑے ہال کو خالی کر کے مسجد کی مانند بنایا گیا تھا۔ ہم لوگ تقریباً ۲۰ آدمی وہاں جمع ہوئے۔ کچھ دیر دینی موضوعات پر گفت گو ہوئی۔ پھر ایک عرب شیخ کی امامت میں ظہر اور عصر کی نماز جمع تقدیم کے ساتھ ادا کی گئی۔ امام مصلے پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے مقتدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: صلاۃ الظہر والعصر جمعاً وقصراً۔ اذان سے لے کر نماز تک کا پورا عمل ٹیلی وژن کے لوگ ریکارڈ کرتے رہے۔ ہال کے کنارے بڑی تعداد میں کھڑے ہوئے لوگ ہماری نماز کو دیکھ رہے تھے۔

نماز کے بعد پورا قافلہ ایک میدان میں جمع ہوا جو خاص طور پر اسی کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہاں شرکار کانفرنس کے علاوہ مقامی لوگ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ وسیع میدان پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ یہاں امن (Peace) کے موضوع پر تقریریں اور دعائیں ہوئیں۔ کچھ اور رسوم ادا کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر دوبارہ ہوٹل میں آگئے۔

جاپان کے بدھوں کی ایک ٹیم کانفرنس میں شریک ہوئی۔ ان کے علاوہ دو آدمی اور جاپان سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب انگریزی بول سکتے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Yasuni Hirose, President, Jinrui Aizenkai
Ten' Onkyo, Kameoka, Kyoto, Japan

انھوں نے بتایا کہ وہ شنٹو مذہب کے ماننے والے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو اسلام سے خاص دلچسپی ہے۔ کیوں کہ ہم لوگ موحد ہیں۔ ہم نے کبھی جاپان کے بادشاہ کو کامی (خدا) نہیں مانا۔ اس کی وجہ سے پہلے ہم مسلسل تعذیب (Persecution) کا شکار رہتے تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد خود جاپان میں یہ عقیدہ ختم ہو گیا کہ ہمارا بادشاہ کامی (خدا) ہے۔ اس لئے اب ہم کو آزادانہ کام کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

اسی طرح البانیہ کے مفتی الحافظ صبری کوتشی (۷۰ سال) نے بتایا کہ قدیم کیونسٹ حکومت وہاں کے مسلمانوں پر بے حد ظلم کرتی تھی۔ خود مفتی صاحب ۱۲ سال تک شدید مشقت کے ساتھ جیل میں رہے ہیں۔ کیونسٹ حکومت نے مدرسے بند کر دئے۔ مسجدیں ڈھا دیں۔ مگر بالآخر

۱۹۹۱ میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد البانیہ کی کمیونسٹ حکومت بھی ختم ہوگئی۔ اب وہاں کامل مذہبی آزادی ہے۔

میں نے سوچا کہ قدیم زمانہ میں فتنہ (مذہبی جبر) کو ختم کرنے کے لئے جنگ کرنی پڑی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ نے خود عالمی حالات میں ایسے اسباب پیدا کر دئے ہیں جو فتنہ بردار حکومتوں کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ یہ زمانی فرق کا ایک معاملہ ہے جس کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ جو لوگ اس زمانی فرق کو نہ سمجھیں وہ موجودہ زمانہ میں دعوت توحید کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکتے۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے عالم اسلام کے قائدین کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ایک ہے مفکر قائد، دوسرا ہے عوامی قائد۔ مفکر قائد وہ ہے جو خود اپنے تخلیقی افکار کی بنیاد پر لوگوں کے اندر ایک نئی سوچ پیدا کرے۔ اور عوامی قائد وہ ہے جو لوگوں کی خواہشات کی ترجمانی کر کے اپنے گرد ان کی بھیڑ اکٹھا کر لے۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مشہور قائدین میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جس کو فی الواقع مفکر قائد کہا جا سکتا ہو۔ موجودہ زمانہ کی مسلم شخصیتوں میں سے کسی بھی شخص کے یہاں تخلیقی فکر کا وجود نہیں۔ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین عوامی قائد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کسی ایک یا دوسری شکل میں عوامی خواہشات کی ترجمانی کر کے ان کے درمیان قیادت کا مقام حاصل کر لیا۔ مگر کسی قوم کی تعمیر صرف تخلیقی مفکرین کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عوامی خواہشات کو استعمال کرنے والا قائد، خواہ وہ کتنا ہی مخلص ہو، وہ اپنی قوم کو صرف ہلاکت کے گڑھے میں پہنچاتا ہے۔ وہ کبھی اس کو فلاح کی منزل تک نہیں لے جا سکتا۔

ہمارا ابتدائی ٹکٹ صرف بروسیلز جانے اور وہاں سے واپس آنے کے لئے تھا۔ مگر لندن اور قاہرہ میں مقیم کچھ عرب نوجوانوں کے مسلسل ٹیلیفون آئے کہ واپسی میں لندن اور قاہرہ میں بھی قیام کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اپنا ٹکٹ ری روٹ کرایا۔ اس کے مطابق واپسی ہوئی۔

۱۶ ستمبر کو فجر کی نماز بروسیلز کی آخری نماز تھی۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد ڈاکٹر لیونارڈو کے ہمراہ ایرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ ضروری کارروائی کے بعد اندر داخل ہوئے تو ایرپورٹ کے چرچ کے فادر مل گئے۔ انھوں نے ہم کو پہچان لیا، کیوں کہ انھوں نے کانفرنس میں ہمیں دیکھا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ یہاں ایر پورٹ کے احاطہ میں ایک مسجد بھی ہے۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے ہمارا شوق دیکھ کر ہم کو مسجد تک پہنچایا۔ ہم نے کچھ وقت اس مسجد میں گزارا۔

یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ لمبائی میں وہ دس قدم ہے اور چوڑائی میں سات قدم۔ میں نے یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے جیسے کمزور آدمی کو ایسے زمانہ میں پیدا کیا جب کہ مذہبی تشدد دنیا سے ختم ہو گیا ہے۔ حتی کہ غیر مسلم حکومت اپنے ہوائی اڈہ کے اندر اپنے مسافروں کی سہولت کے لئے مسجد کی تعمیر کر رہی ہے۔ مسجد میں چند کتابیں تھیں جن میں قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ بھی شامل تھا۔

مسجد میں بہت سے مسافر آتے اور جاتے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ چھوٹی ہونے کے باوجود وہ مسافروں کے لئے سکون کی ایک جگہ ہے۔ مسجد میں قیام کے دوران ایک سفید فام تندرست آدمی آئے۔ ان کا سر کھلا تھا۔ وہ نیکر پہنے ہوئے تھے جس میں گھٹنوں سے اوپر تک کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اسی حالت میں وہ نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور دو رکعت نماز ادا کی۔ وہ لبنانی مسلمان ہیں اور امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا نام حسین مروّۃ (Hussein Mroiueh) بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تاجر ہیں۔ پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں۔ گفتگو میں کافی سنجیدہ نظر آئے۔

ایر پورٹ پر چلتے ہوئے ایک جگہ سگریٹ کا اشتہار نظر آیا۔ یہ ایک مشہور سگریٹ کا خوبصورت اشتہار تھا۔ سگریٹ کے کھلے پیکٹ کے ساتھ سگریٹ کا نام روشن حرفوں میں درج تھا۔ اس کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

The taste of success

سگریٹ کے نقصانات کو دیکھئے تو یہ برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق نظر آئے گا۔ الٹا نام رکھنے کا یہی طریقہ انسانی دنیا میں بھی رائج ہے۔ کہیں تشدد کی تحریک کو پرامن تحریک کہا جاتا ہے۔ کہیں کسی مخرب اعظم کا نام لوگوں نے مفکر اعظم رکھ لیا ہے۔ کہیں ایک استغلالی منصوبہ کو فلاحی منصوبہ کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

۱۶ ستمبر کو بروسیلز سے لندن کے لئے برٹش ایرویز کی فلائٹ ۳۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں برٹش ایرویز کی میگزین (Highlife) کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۲ دیکھا۔ ۱۷۰ صفحہ کے اس

میگزین میں زیادہ تر رنگین اشتہارات چھپے ہوئے تھے۔ جہاز، مکان، فرنیچر، گھڑی، زیور وغیرہ کے اشتہارات۔ اشتہارات میں بار بار اس قسم کے الفاظ درج تھے:

Pleasure, happiness, enjoyment,
desire, lovely, delight, charming.

میں نے سوچا کہ انسان ایک لذت پسند مخلوق ہے۔ اس کے اندر سب سے زیادہ جس چیز کی طلب ہے وہ خوشی اور لذت کا حصول ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ فیھا ماتشتھیہ الانفس وتلذ الاعین (الزخرف ۷۱) بہت بامعنی ہے۔ انسان کو سماجی حیوان یا سیاسی حیوان یا اقتصادی حیوان کہنا محض سطحی تعبیر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ انسان ایک ایسا وجود ہے جو اپنی پسندیدہ چیزوں سے ابدی طور پر محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ اور اس حظ کا حصول جنت کے سوا کہیں اور ممکن نہیں۔

بروسیلز سے جہاز ۱۲ بجے دن کو روانہ ہوا تھا۔ ۱۹ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک گھنٹہ پرواز کرنے کے بعد جب وہ لندن ایرپورٹ پر اترا تو دوبارہ لندن کی گھڑیوں میں ۱۲ بج رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لندن کا وقت بروسیلز کے وقت سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔

۱۶ ستمبر کو لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر ضروری کارروائی کے بعد باہر آیا تو دو صاحبان ہمارے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ ایک انیس تاری صاحب، دوسرے، عارف عبدالسلام احمد۔ میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں دعوتی کام کتنا آسان ہو چکا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایک داعی کو اجنبی دنیا میں داخل ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ آج یہ حال ہے کہ ایک داعی جس ملک میں بھی جائے وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے استقبال کے لئے موجود ہوگی۔ حتی کہ زمانہ کی یہ تبدیلی یہاں تک پہنچی ہے کہ غیر مسلم صاحبان بھی یہ موقع دے رہے ہیں کہ ایک اسلامی داعی ان کے مقام تک پہنچے اور وہ اس کو اپنے اجتماع میں آزادانہ طور پر بولنے کا موقع دیں۔

یہاں میں نے ثانی اثنین خان کو لندن میں چھوڑ دیا۔ اور خود ایرپورٹ ہی سے برادر عارف عبدالسلام احمد کے ساتھ مانچسٹر جانے کا فیصلہ کیا۔ لندن ایرپورٹ سے ٹرین (انٹرسٹی) کے ذریعہ مانچسٹر کے لئے روانگی ہوئی۔ خوب صورت اور منظم انداز میں بنی ہوئی یہ ٹرین نہایت آرام دہ تھی۔ روانگی کے وقت سے آخر تک کسی سیٹی کی آواز نہیں آئی۔ کبھی چین پلنگ نہیں ہوئی۔ کسی قسم کا

شور یا جھگڑا دکھائی نہیں دیا۔ راجدھانی ایکسپریس کی طرح ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے ٹرین کا شور بھی اندر نہیں آرہا تھا۔ ہوائی جہاز کی کرسیوں کی طرح کشادہ الگ الگ سیٹوں پر لوگ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اکثر افراد کتاب یا اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک تعلیم یافتہ انگریز ایک کافی موٹی کتاب (Administrative law) پڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ وہ کاغذ پر نوٹ لیتا جاتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک کشادہ میز تھی جس پر اس نے اپنا کاغذ اور قلم رکھ لیا تھا۔ چلنے کی حالت میں ڈبہ اتنا کم ہل رہا تھا کہ آدمی میز کے اوپر کاغذ رکھ کر بآسانی لکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے سفرنامہ کی کچھ سطریں اسی میز پر چلتی ہوئی حالت میں لکھیں۔

ڈبہ کے دونوں طرف کھڑکی کے بجائے بڑے بڑے شیشہ لگے ہوئے تھے۔ ان سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھائی گھنٹہ کے سفر میں دونوں طرف یا تو ہرے بھرے کھیت اور میدان نظر آئے یا خوب صورت مکانات۔ کہیں بھی جھگی جھونپڑی جیسا منظر دکھائی نہیں دیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر مطلوب اسٹیشن پر پہنچ گئی۔

ٹرین کا نظام اپنے مسافروں (customers) کے ساتھ ہر موقع پر تعاون دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک مسافر نے گفتگو کے دوران بتایا کہ چند مہینے پہلے وہ اسی لائن پر مانچسٹر سے لندن کے لئے سفر کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ٹرین کے لندن پہنچنے میں پانچ منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ اس کی بنا پر وہ اور دوسرے مسافر اپنے گھروں کو جانے کے لئے انڈر گراؤنڈ ٹرین حاصل نہ کر سکے کیونکہ ۱۲ بجے رات کے بعد اس کا چلنا موقوف ہو جاتا ہے۔ اب مجبوراً ان لوگوں کو ٹیکسی لینا تھا جب کہ انڈر گراؤنڈ ٹرین سے سفر بہت سستا ہے۔

کچھ مسافروں نے ریلوے عملہ کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کیا۔ فوراً ہی اعلان کر دیا گیا کہ جو لوگ تاخیر کی وجہ سے انڈر گراؤنڈ ٹرین نہیں لے سکے ہیں وہ فلاں کاؤنٹر پر آکر ہم سے ٹیکسی کا کرایہ لے لیں، اور ٹیکسی کے ذریعہ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

میرا قیام وگن (Wigan) میں ایک تعلیم یافتہ عرب نوجوان طارق حسین الکردی کے مکان پر تھا۔ انھوں نے یہاں کی شہریت لے لی ہے اور اب اپنی آئرش اہلیہ کے ساتھ مستقل طور پر یہیں رہتے ہیں۔ ۱۶ ستمبر کی رات کو یہاں چند عرب نوجوانوں کے ساتھ دیر تک گفتگو ہوئی۔ میں نے قرآن کی آیت

(اِنّ فی ذالک لآیات للمتوسمین) اور بخاری کی حدیث (ما خیّر بین امرین الّا اختار ایسرھما) کی تشریح کی اور مختلف واقعات کے ذریعہ اس کو واضح کیا۔ لآیات للمتوسمین کے سلسلہ میں کہا کہ عربی میں کہا جاتا ہے کہ تَوَسَّمتُ فیہ الخیر ۔ یعنی میں نے اس کے اندر کچھ علامتیں دیکھیں جن سے میں نے استنباط کیا کہ اس کے اندر خیر ہے۔ متوسّم وہ ہے جو ظاہری چیزوں سے باطنی حقیقتوں کو دریافت کرے اور ان کو اپنے لئے نصیحت بنائے۔

۷ ستمبر کو بھی عرب نوجوانوں کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ طارق حسین الکردی نے آئرلینڈ کی شہریت لی ہے مگر آجکل وہ انگلینڈ میں رہ رہے ہیں۔ آئرلینڈ میں زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں اور انگلینڈ میں زیادہ تر کیتھولک۔ دونوں میں سخت نفرت ہے۔ برنارڈ شا ایک آئرش مصنف تھا۔ وہ انگریزوں کی زبان اور کلچر کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مثلاً انگریزی زبان کے تلفظ کے نقائص بتاتے ہوئے ایک بار اس نے کہا کہ اگر میں انگریزی کے لفظ (Fish) کو گھوٹی پڑھوں تو کوئی انگریز اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

میں نے طارق حسین الکردی سے پوچھا کہ آپ کی جنسیہ آئرش ہے ، پھر آپ انگلینڈ میں کس طرح رہتے ہیں اور یہاں کے قانون کے مطابق آپ کو یہاں کی تمام سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ دونوں کے درمیان نفرت پائی جاتی ہے۔ مگر دونوں ملکوں کے درمیان اتفاقیہ (ایگریمنٹ) ہے کہ ایک جگہ کے شہری کو دوسری جگہ وہی سہولتیں حاصل رہیں جو اس کو اپنے ملک میں حاصل ہیں۔

انگلینڈ اور آئرلینڈ میں جو اختلافات ہیں وہ تقریباً اسی قسم کے ہیں جو ہندستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آئرلینڈ والوں کو شکایت ہے کہ انگلینڈ والے عظیم تر انگلینڈ بنانا چاہتے ہیں اور اس میں آئرلینڈ کو ضم کرلینے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔ وغیرہ ۔ مگر اس قسم کے اختلافات کے باوجود یہاں دونوں ملکوں میں جو مفاہمت ہے وہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان ناقابل تصور ہے۔ مغربی دنیا کا مزاج اس انگریزی مثل سے معلوم ہوتا ہے کہ آؤ ، ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے :

Let us agree to disagree

جن دنوں میں طارق حسین الکردی کے یہاں مقیم تھا، مقامی میٹرو پولیٹن کونسل کے چیف رننگ آفیسر مسٹر اے شا (A. Shaw) کی طرف سے ان کو ایک خط مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ ملا۔ طارق حسین الکردی اس وقت کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کو بے روزگاری کا الاؤنس اور دوسری رعایتیں ملی ہوئی ہیں۔ مذکورہ خط میں درج تھا کہ آپ نے اب تک (Housing Benefit) کا فارم پُر کر کے نہیں بھیجا ہے، جب کہ آپ اس کے حق دار ہیں۔ لہٰذا ہمارے آفس کی طرف سے آپ کو فارم بھیجا جا رہا ہے۔ آپ اس کو ایک ہفتہ کے اندر پر کر کے بھیج دیں تاکہ آپ کو مکان کے سلسلہ میں ضروری رعایت دی جا سکے۔

طارق حسین الکردی نے بتایا کہ بے روزگار یا کم آمدنی والے شہریوں کو یہاں ۹۵ فی صد تک کرایہ مکان میں امداد دی جاتی ہے۔ یعنی کرایہ مکان کا بڑا حصہ کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان کو حکومت کے خزانہ سے ادا کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے آدمی کو دفتروں میں دوڑنا پڑتا ہے۔ پھر بھی رشوت کی قیمت دئے بغیر اس کو اپنا واجبی حق نہیں ملتا۔ یہاں خود حکومت دوڑ رہی ہے کہ وہ حقدار تک ان کا حق پہنچائے۔ اور جہاں تک کرایہ دار کی طرف سے کرایہ ادا کرنے کا تعلق ہے، اس کا تو ہندستان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس قسم کے مختلف واقعات یہاں لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوئے اس کے بعد میں نے سوچا کہ مسلم لیڈروں نے انگریزی قوم کے سلسلہ میں کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے نام نہاد آزادی کے مسئلہ کو لے کر انگریزوں سے اتنا متنفر کیا گیا کہ "نفرت انگریز" ان کے ایمان کا حصہ بن گیا۔ حتی کہ مقدس اکابر تک کے تذکرہ میں یہ لکھا جانے لگا کہ "حضرت کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی"۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی "رشدی" جیسے مسائل کو لے کر یہ مخالفانہ پروپگنڈا جاری ہے۔

مسلم رہناؤں پر فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ انگریز قوم کو دعوت کا موضوع بنائیں۔ مگر انھوں نے اس کے برعکس یہ کیا کہ انگریز قوم کو نفرت اور عداوت کا موضوع بنا دیا۔ یہ ایک مجرمانہ غلطی تھی نہ کہ کوئی واقعی اسلامی کام۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ سو سالہ انگریز مخالف کوششیں حبط اعمال کا شکار ہو گئیں۔ کسی بھی درجہ میں ان کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ حتی کہ جن اکابر نے انگریز کو اسلام کا ازلی دشمن بتایا تھا، انھیں کی اولادیں اور انھیں کے شاگرد اب انگریز کے ملک میں آکر آباد

ہو رہے ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ میں یو کے میں سٹل ہوگیا ہوں۔

۷ ستمبر کی شام کو بولٹن کی زکریا مسجد دیکھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ برطانیہ میں بنائی جانے والی دوسری مسجد ہے۔ باہر سے دیکھنے میں یہ مسجد یہاں کے معروف مکان کی مانند نظر آتی ہے۔ نماز کا حصہ بڑے ہال کی مانند ہے۔ اس کے اندر بچوں کا مدرسہ قائم ہے۔ میں جس وقت مسجد میں داخل ہوا تو وہاں بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز اسی طرح سنائی دے رہی تھی جس طرح ہندستان کی ان مسجدوں میں سنائی دیتی ہیں جہاں مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی قائم ہے۔ مسجد صاف ستھری تھی۔ تین آدمی ایک کنارے بیٹھے ہوئے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ مسجد کے اندر سکون کا ماحول نظر آیا۔ مسجد کے بیرونی حصہ میں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا:

To all Muslim brothers, please give your Lillah donations.

مسجد دیکھنے کے بعد میں اپنے تین عرب ساتھیوں کے ہمراہ شہر کے باہر گیا۔ یہاں پہاڑیاں تھیں۔ اور قدرتی مناظر کا ماحول تھا۔ یہاں کی خالص ہوا میں ہم لوگوں نے کچھ وقت گزارا۔ اور اس کے بعد گھر واپس آگئے۔

پہاڑی کے دامن میں ایک مقام پر گھوڑے کا فارم تھا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک انگریز بچہ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو گولائی میں دوڑا رہا ہے۔ بچہ کی عمر غالباً دس سال ہوگی۔ اور گھوڑا نہایت قوی ہیکل تھا۔ مگر وہ مکمل طور پر بچہ کے قابو میں تھا۔ بچہ جس طرف چاہتا اس کو لے جاتا اور جہاں چاہتا اس کو کداتا۔ میں نے اپنے عرب ساتھیوں سے کہا کہ یہی تسخیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کی فطرت اس طرح بنائی ہے کہ وہ انسان کی تابعداری کو قبول کر لے۔ اگر گھوڑے میں یہ پیدائشی صفت نہ ہوتی تو ناممکن تھا کہ انسان کا ایک بچہ اس طرح اس کو قابو میں کر کے اس کو اپنی سواری بنا سکے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ یہ تسخیر کہیں براہ راست ہے اور کہیں بالواسطہ۔ یعنی کچھ چیزیں ایسی ہیئت پر بنائی گئی ہیں کہ وہ ہمیشہ انسان کے موافق رہیں۔ مثلاً زمین کی کشش یا سورج کی گرمی۔ اور کچھ چیزوں میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ انسان اپنے تصرف سے ان کو اپنے موافق بنا سکے۔ مثلاً گھوڑا یا

مویشی۔ اگر تسخیر کا یہ عمل پیشگی طور پر نہ کر دیا گیا ہوتا تو انسان کے لئے زمین پر زندہ رہنا یا تمدن کی تعمیر کرنا ممکن نہ ہوتا۔

وگن کے قیام کے دوران میری ملاقاتیں صرف عرب نوجوانوں سے یا کچھ انگریزوں سے ہوئیں۔ یہ عرب نوجوان یہاں غیر مسلموں میں دعوتی کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ خاص اسی مقصد کے لئے یہاں آکر مقیم ہوئے ہیں۔ وہ الرسالہ انگریزی لوگوں کو پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اور ہمارے یہاں کی انگریزی مطبوعات منگوا کر اس کو پھیلا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ الرسالہ کے دعوتی مضامین چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ایک خاموش دعوتی عمل ہے جس میں وہ لوگ رات دن مصروف رہتے ہیں۔

ان عرب نوجوانوں نے انگریزی زبان بخوبی سیکھ لی ہے۔ اب ان کا خیال ہے کہ ان میں سے ہر شخص کسی اور یورپی زبان کو کم از کم بقدر ضرورت سیکھے تاکہ وسیع تر دعوتی روابط قائم کرنے میں سہولت ہو۔ باہمی مشورہ سے طے ہوا کہ آپ لوگ کم از کم فی الحال اپنا کوئی الگ ادارہ قائم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ جو مسلم ادارے برطانیہ میں قائم ہو چکے ہیں یا پہلے سے کام کر رہے ہیں ان سے جڑ کر اپنا مثبت کام جاری رکھیں۔

ایک مجلس میں کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگ بھڑکتے ہیں۔ آپ کو تنقید چھوڑ دینا چاہئے تاکہ لوگ آپ کے قریب آسکیں۔

میں نے کہا کہ تنقید پر بگڑنا، ایک قسم کا ذہنی نقص ہے جس کو علماء نفسیات دو قسمی طرز فکر (dichotomous thinking) کہتے ہیں۔ ایسا آدمی چیزوں کو صرف دو قسم میں رکھ کر سوچ پاتا ہے۔ وہ کسی تیسری قسم کو نہیں جانتا۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس کے اکابر پر تنقید کی جائے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ تنقید اس کے اکابر کو ڈسکریڈٹ کر رہی ہے۔ وہ یا تو بے تنقید حالت کو جانتا ہے یا با تنقید حالت کو۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس آدمی پر تنقید کی جا رہی ہے وہ غلط انسان ہے اور جس آدمی پر تنقید نہ کی جائے وہ صحیح انسان۔

حالاں کہ یہاں ایک تیسری حالت بھی ہے جس کو حدیث میں اجتہادی خطا کی حالت بتایا گیا ہے۔ یعنی آدمی بذات خود صحیح اور قابل قدر ہو مگر کسی معاملہ میں اس سے اجتہادی غلطی ہو جائے۔

اس قسم کی غلطی کسی بھی شخص سے ہوسکتی ہے، حتی کہ صلحاء سے بھی۔ ایسی غلطی کی نشاندہی کرنا نہ تو کوئی نامحمود فعل ہے اور نہ کسی کے بارہ میں ایسی غلطی کا ثابت ہونا اس کی شخصیت کو ختم کرنے کے ہم معنی ہے۔

میری قیام گاہ پر بہت سی عربی کتابیں تھیں، ان میں سے کچھ کتابوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ابن جوزی البغدادی (م ۵۹۷ھ) کی مشہور کتاب تلبیس ابلیس کو پڑھتے ہوئے کئی سبق آموز چیزیں نظر آئیں۔ صفحہ ۲۸۳ - ۲۸۴ پر انھوں نے لکھا ہے کہ سعید بن مسیب نے کہا کہ اصحاب رسول شام میں تجارت کرتے تھے، ان میں طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید ہوتے تھے۔ احمد بن حنبل نے توکل کے نام پر گھر بیٹھ رہنے کے خلاف کہا کہ اصحاب رسول بر اور بحر میں تجارت کرتے تھے۔ وہ کھجور کے باغوں میں کام کرتے تھے اور انھیں کے اندر ہمارے لئے نمونہ ہے (کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتجرون فی البر والبحر ویعملون فی نخیلہم ولنا القدوۃ بہم):

عن احمد ان رجلا قال لہ۔ ارید الحج علی التوکل فقال لہ فاخرج فی غیر القافلۃ فقال لا۔ قال فعلی جراب الناس توکلت	امام احمد سے ایک شخص نے کہا کہ میں توکل کی بنیاد پر حج کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اس سے کہا کہ پھر تم قافلہ کے بغیر نکلو۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم نے لوگوں کے نیچے کھچے پر توکل کیا ہے۔

ابن جوزی غیر معمولی ذہین اور قابل شخص تھے۔ ان کی تفسیر قرآن (زاد المسیر فی علم التفسیر) نہایت قیمتی ہے۔ جو لوگ قرآن کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو ابن جوزی کی تفسیر قرآن ضرور پڑھنا چاہئے۔ یہ تفسیر ابھی تک صرف عربی زبان میں ہے۔ میرے علم کے مطابق اس کا ترجمہ ابھی تک کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوا۔

۱۸ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ تین عرب نوجوانوں کے ساتھ میں وگن سے مانچسٹر گیا۔ ہم ایک بلڈنگ کے پاس اترے۔ معلوم ہوا کہ اس کی چوتھی منزل پر مسجد ہے۔ ہم لوگ ایک قدیم لفٹ میں داخل ہوکر اوپر پہنچے۔ یہاں دوبارہ ایک قدیم طرز کا ہال تھا۔ فرش سے لے کر دیوار تک ہر چیز فرسودہ حالت میں نظر آئی۔ میں نے چل کر دیکھا تو اس کا اندرونی حصہ چوڑائی میں ۲۳ قدم اور لمبائی میں ۳۱ قدم

تھا۔ باہر کے ایک بورڈ سے معلوم ہوا کہ نئی مسجد کی تعمیر کے لئے رقم کی فراہمی جاری ہے۔ مسجد کا وضو خانہ جدید اور صاف ستھرا نظر آیا۔

امام صاحب نے انگریزی میں خطبہ دیا۔ دو خطبوں میں کچھ عربی کلمات کے ساتھ انھوں نے انگریزی میں تقریر کی۔ تقریر کا مضمون آخری حد تک روایتی تھا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ان کی دونوں تقریروں سے حاضرین کوئی سبق کی بات لے کر گئے ہوں۔ کیوں کہ سبق کی کوئی بات سرے سے تقریر میں موجود تھی ہی نہیں۔ تقریر کے دوران وہ بار بار "آور پرافٹ صلی اللہ علیہ وسلم" کا لفظ بول رہے تھے۔ یہی تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول کو سارے عالم کا پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ مگر مسلمانوں نے اس کو اپنا پیغمبر بنا دیا۔ کیوں کہ جیسا کہ خطیب نے کہا، مسلمان پیغمبر کو اپنا پرائڈ سمجھتے ہیں۔ اور پرائڈ کی نفسیات کی تسکین کے لئے ضروری ہے کہ اس کو "اپنے پیغمبر" کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ دور زوال میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ ہمارے علماء قرآن و حدیث کو فروعی باتوں پر منطبق کرنا جانتے ہیں مگر وہ ان کو اساسی امور پر منطبق کرنا نہیں جانتے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ مونچھ کو تراشو اور داڑھی کو بڑھاؤ (اعفوا اللحی وقصوا الشوارب) اب اگر کوئی شخص کہے کہ داڑھی کو تراشو اور مونچھ کو بڑھاؤ تو علماء فوراً کہیں گے کہ یہ بدعت ہے۔ مگر زیادہ بڑے بڑے اور اساسی مسائل میں وہ خود احداث (بدعت) میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

مانچسٹر میں ایک دیندار مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران "یونی پولر ورلڈ" کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے غصہ اور تشویش کے انداز میں کہا کہ جارج بش نے کہا ہے کہ اب کسی ملک میں پریسیڈنٹ یا پرائم منسٹر ہماری مرضی کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے عزائم کتنے خطرناک ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ماشاء اللہ دین دار ہیں۔ یقیناً آپ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے ہونگے۔ کیا آپ نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی: قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک

من تشاء وتنزع الملك ممّن تشاء وتعزّ من تشاء وتذلّ من تشاء بيدك الخير إنّك على كلّ شئ قدير (آل عمران ۲٦) آپ کو اس کے جواب میں کہنا چاہئے تھا کہ امریکی پریسیڈنٹ نے یہ ایسی بات کہی ہے جو اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ قرآن کی صراحت کے مطابق کسی کو حکمراں بنانا یا کسی کو حکمرانی سے ہٹانا یہ مکمل طور پر اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے۔ پھر ایسی بے معنی بات پر تشویش کی کیا ضرورت۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں قرآن پڑھنے والوں کا طرز فکر بھی قرآنی طرز فکر نہیں۔ لوگ ٹوپی اور داڑھی کے معاملہ میں سنت رسول کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر انھیں اس سنت رسول کی خبر نہیں کہ عرب کی ایک مشرک عورت نے آپ کو مذمم کہا تو آپ نے اس کو لغو سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا اور فرمایا کہ اس عورت کو دیکھو، یہ مجھ کو مذمم کہہ رہی ہے حالاں کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ مجھ کو تاریخ میں محمدؐ کا مقام عطا کرے۔

اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر فضول گو سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں حالاں کہ یہ بھی پیغمبر اسلام کی ایک سنت ہے کہ فضول گو لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنا مثبت کام جاری رکھا جائے۔

وگن کی ایک چھوٹی لائبریری میں مشہور انگریز سائنس داں سر جیمز جینز کی کتاب طبیعیات اور فلسفہ (Physics and Philosophy) دیکھی۔ اس کے دیباچہ (Preface) کے نیچے مصنف کے دستخط کے ساتھ ۸ جولائی ۱۹۴۲ کی تاریخ درج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب ۱۹۴۱-۴۲ میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا سب ٹائٹل مصنف نے ان الفاظ میں تجویز کیا ہے ـــــ ایک طبیعیات داں کے تاثرات کچھ فلسفیانہ مسائل کے بارہ میں:

The reflections of a physicist on some of the problems of philosophy.

مصنف نے زیر بحث موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کی سائنس نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے اس کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے، بشرطیکہ ہم اس کا دستہ حاصل کر سکیں:

it almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle. (p. 216)

مصنف نے مزید لکھا ہے کہ اگر جدید معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادہ پرستی کے نظریہ کی نئی سائنسی معلومات کی روشنی میں از سرِ نو تشریح کرنے کی ضرورت ہے:

materialism need to be redefined in the light of our new scientific knowledge. (p. 216).

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ۴۲ - ۱۹۴۱ میں ہمارے رہنما جس وقت انگریز کو نفرت اور عداوت کا موضوع بنا کر اس سے لڑ رہے تھے، عین اسی وقت انگریز کا علم اس کو اس مقام پر پہنچا رہا تھا کہ سائنس اور مادی تہذیب اپنی ساری ترقیوں کے باوجود ناکافی ہے۔ لمبا علمی سفر طے کرنے کے بعد وہ جہاں پہنچا ہے وہاں اس کو دکھائی دے رہا ہے کہ سامنے کا دروازہ بند ہے، اور اس کو کھولنے کے لئے جو ہینڈل درکار ہے وہ اس کو حاصل نہیں۔

یہ "ہینڈل" خوش قسمتی سے قرآن کی صورت میں ہمارے پاس تھا۔ اور مغربی طرز کی مادیت کے مقابلہ میں زیادہ صحیح دنیاوی نقطۂ نظر بھی قرآن وسنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود تھا۔ مگر دعوتی ذہن کی غیر موجودگی کی بنا پر ہمارے رہنما اس امکان کو دریافت نہ کر سکے۔ وہ انگریزوں کو صرف دشمن کے روپ میں دیکھتے رہے، حالاں کہ امکانی طور پر وہ دوست اور رفیق کی حیثیت رکھتا تھا۔

۷ ستمبر کو میں وگن کے مکان میں تھا۔ صاحب بیت نے ایک اخبار لاکر دیا۔ اس کا نام وگن رپورٹر (Wigan Reporter) تھا۔ اور وہ ۸۰ صفحہ پر مشتمل تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ہفتہ وار اخبار ہے اور لوگوں کے درمیان بلا قیمت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ضخیم اخبار اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں زندگی کا طریقہ کیا ہے۔ یہ "اخبار" کے نام پر اشتہار کو گھر گھر پہنچانے کی ایک تدبیر ہے۔ مگر شاید ہی کوئی شخص ہو جو اول سے آخر تک اسے دیکھتا ہو۔

برطانیہ سے قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ چھپا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میں نے دیکھا۔ متن کے بغیر وہ ۵۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مترجم کی حیثیت سے اس پر دو نام لکھے ہوئے تھے:

Dr Ahmad Zidan, Mrs Dina Zidan

مختلف مقامات پر اس ترجمہ کو دیکھا۔ مجھے زیادہ پسند نہ آسکا۔ سورہ الحجر میں آیت ۷۵ (وفی ذالك لآیات للمتوسمین) کا ترجمہ اس طرح کیا گیا تھا:

Surely in this are signs for those who reflect upon events.

اس ترجمہ سے آیت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ عبد اللہ یوسف علی نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ نسبتاً زیادہ واضح ہے۔ ان کے ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:

Surely in this are signs for those who by tokens do understand.

۱۶ ستمبر کو لندن ایئر پورٹ ہی سے ثانی اثنین خان کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ وہ ایئر پورٹ سے پروفیسر انیس قاری کے ساتھ چلے گئے اور ان کے تعاون سے لندن میں الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کے تعارف میں مشغول ہو گئے۔ میں ایئر پورٹ سے نکل کر ریلوے اسٹیشن گیا اور بذریعہ ٹرین وگن (Wigan) چلا آیا۔

وگن میں میں اردو دنیا سے کٹا ہوا ہوں۔ اب تک کسی بھی اردو داں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہاں میں ایک مکان میں مقیم ہوں۔ صبح سے شام تک یہاں ایک ہی مشغلہ ہے۔ چار عرب نوجوان اور میں ایک کمرہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ تمام عرب تعلیم یافتہ ہیں۔ میں عربی زبان میں ان کے سامنے اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہوں۔ اس میں ایک طرف قرآن و سنت اور دوسری طرف جدید واقعات سے استشہاد کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ اور جہاں سمجھ میں نہیں آتا، اس کے بارہ میں سوال کر کے مزید وضاحت کراتے ہیں۔

یہ ایک انوکھی قسم کی مجلس ہوتی ہے جس کی کوئی دوسری مثال میرے علم میں نہیں۔ میری عربی ہندستانی عربی ہوتی ہے۔ اس میں صلات کی اور تذکیر و تانیث کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان عرب نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک طرف ٹیپ ریکارڈر پر ایک ایک لفظ محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف قلم کاغذ لے کر اس کو برابر تحریر کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ نماز فجر کے بعد سے لے کر نماز عشاء کے بعد تک مسلسل جاری رہتا ہے۔

۱ مغرب (مراکو) کی وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے مغرب کا سفر کیا۔ وہاں دو ہفتہ قیام رہا۔ اس درمیان میں کئی پروگرام ہوئے۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ ۱۱ فروری کو سفر شروع ہوا اور ۲۶ فروری ۱۹۹۴ کو واپسی ہوئی۔

۲ برلن (جرمنی) کے ڈاکٹر مائیکل شیڈ (Dr. Michael Schied) بابری مسجد کے مسئلہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ۲۶ فروری ۱۹۹۴ کو وہ مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو اس مسئلہ پر ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ بابری مسجد کا مسئلہ ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا۔ مگر مسلم لیڈروں نے اس کو انتہائی غیر متناسب طور پر بڑھا کر موجودہ حالت تک پہنچا دیا۔ اسلامی اصول کے مطابق، اس المیہ کی تمام تر ذمہ داری نا اہل مسلم لیڈروں پر آتی ہے۔

۳ امریکہ میں مقیم ایک مسلمان مسٹر رفیق لودھیانہ نے امریکہ میں منظم انداز میں الرسالہ مشن کو پھیلانے کا کام شروع کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی الرسالہ کے منتخب مضامین کو لیکر ان کا ایک مجموعہ بنایا ہے۔ ان مضامین کی ۲۵۰۰ کاپیاں بنا کر وہ ان کو ملک کے مختلف علاقوں میں سنجیدہ افراد کے درمیان تقسیم کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک انگریزی میگزین بھی نکالنا چاہتے ہیں جس میں الرسالہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

۴ انگریزی اخبار دی ایشین ایج کی اسپیشل کرسپانڈنٹ شیلا ریڈی نے ۲۶ فروری ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کا ہمارے نزدیک سب سے بڑا مشترک مسئلہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے شعور کی ناپختگی۔

۵ ہندی ہفت روزہ نئی زمین کی نمائندہ مینا پانڈے نے یکم مارچ ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بندے ماترم کے مسئلہ سے تھا۔

۶ ہفت روزہ نئی دنیا (نئی دہلی) کے نمائندہ مولانا عقیدت اللہ قاسمی نے ۳ مارچ ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر زکوٰۃ کی تنظیم اور اس کے شرعی مسائل سے تھا۔

۷ آل انڈیا ریڈیو (نیشنل چینل) سے ۴ مارچ ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا: روزہ اور انسانی قدریں۔

۸ نیوز ایجنسی ارنا (IRNA) کے نمائندہ مسٹر سعید عالم نے ۹ مارچ ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر فلسطین کے مسئلہ سے تھا۔ خاص طور پر یہ کہ ۲۵ فروری ۱۹۹۴ کو ہیبرون کی مسجد ابراہیم میں فجر کی نماز کے وقت اسرائیلی نے فائرنگ کر کے پچاس فلسطینیوں کو جس طرح شہید کر دیا ہے، اس کا کیا اثر فلسطین کی سیاست پر پڑے گا۔

۹ جاگرن وچار منچ (دینک جاگرن) کی طرف سے ۱۲ مارچ ۱۹۹۴ کو نئی دہلی (تین مورتی بھون) میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع انڈین کلچر تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔

۱۰ راشٹر پہل منچ کی طرف سے ۱۷ مارچ ۱۹۹۴ کو ہماچل پردیش بھون میں ڈنکل ڈرافٹ ورودھی سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۱ مالب (گوڑ گاؤں) کی نو تعمیر مسجد میں ۱۸ مارچ ۱۹۹۴ کو ایک جلسہ ہوا۔ قاری محمد سلیمان صاحب اس کے ناظم تھے۔ منتظمین جلسہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور حقیقت عبادت کے موضوع پر تقریر کی۔ مختلف علاقوں کے علماء اور مسلمانِ میوات بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

۱۲ گاندھی سمرتی (برلا ہاؤس) میں ۲۸ مارچ ۱۹۹۴ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ یہ مہاتما گاندھی کے بارہ میں تھی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کی روداد اخبار قومی آواز ۳۱ مارچ ۱۹۹۴ میں شائع ہوئی ہے۔

۱۳ ٹوکیو (جاپان) کے بدھسٹ ادارہ (Shakuson kai) کے پریسیڈنٹ کلنے ہیرو اونو (Rev. Kanehiro Ono) کی آمد کی تقریب میں ۲۵ مارچ ۱۹۹۴ کو نئی دہلی کے اچاریہ سوشیل کمار آشرم میں ایک مذہبی میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مختصر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۴ لندن سے بی بی سی کے نمائندہ مسٹر قربان علی نے ۲۸ مارچ ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر شرعی عدالت کے قیام سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اس وقت شرعی عدالت سے زیادہ ضروری کام لوگوں میں شرعی مزاج بنانا ہے۔ شرعی مزاج جب تک نہ پیدا ہو شرعی عدالت کا کوئی فائدہ نہیں۔

۱۵ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپرس کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر بھاسکر رائے نے ۲۹ مارچ ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلیفون پر ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ نمبر ایک تعلیم ہے۔ اگر ان میں صد فی صد تعلیم آجائے تو بقیہ مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۱۶ ٹائمس آف انڈیا کی نمائندہ مسز سکینہ یوسف خان نے ۳۱ مارچ ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اسلامی مدارس کے بارہ میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ اسلامی مدارس کی اہمیت ملی اور سماجی اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہے۔ کیوں کہ یہ مدارس گویا اخلاق اور کردار پیدا کرنے کے ادارے ہیں۔ یہ سماج میں اخلاقی روایات کو باقی رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ اگر یہ مدارس نہ رہیں تو ہمارے سماج میں اخلاقی روایات کا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔

۱۷ دہلی کے ویویکانند فاؤنڈیشن (پٹ پڑگنج) میں ۱۳ اپریل ۱۹۹۴ کو راشٹر ایکتا سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ باہمی احترام کے ذریعہ ملک میں ایکتا لائی جا سکتی ہے۔

۲۱ بمبئی کے اردو روزنامہ اخبار عالم کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اخبار عالم کے شمارہ ۲ جنوری ۱۹۹۴ میں مکمل طور پر شائع ہوا ہے۔ اس میں ان تمام اعتراضات کا واضح جواب دیا گیا ہے جو آجکل بعض حلقوں کی طرف سے بے بنیاد طور پر الرسالہ مشن کے بارہ میں کئے جا رہے ہیں۔

۲۲ ہندستان ٹائمس کی نمائندہ مسز کم چڈھا نے ۲۴ جنوری ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر موصوف کے حالیہ امریکہ کے سفر سے تھا۔

۲۳ کانچی پورم کے شنکر اچاریہ چندر شیکھر بیندر جی کا ایک سو ایک سال میں دسمبر ۹۳ میں انتقال ہو گیا۔ ان کو شردھا نجلی دینے کے لئے ہماچل بھون (نئی دہلی) میں ۲۵ جنوری ۱۹۹۴ کو ایک تقریب ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مختصر تقریر کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲۴ جین اسٹوڈیو نئی دہلی نے ۲۷ جنوری ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کی۔ یہ تقریر رمضان کے روزہ کے بارہ میں تھی۔ ایک گھنٹہ کی تقریر میں روزہ کے احکام اور اس کی حکمتیں بیان کی گئیں۔ یہ پروگرام سٹلائٹ ٹی وی کے ذریعہ پورے جنوبی ایشیا میں دکھایا جائے گا۔

۲۵ بی بی سی کی نمائندہ مسز سونیتا ٹھاکر نے ۲۸ جنوری ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام کے مسائل خاص طور پر نکاح و طلاق سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام پر تشدد پسندی کا جو الزام لگایا جا رہا ہے وہ اگر صحیح ہو تو اس کا الزام ان مسلمانوں پر ہوگا جو بعض ملکوں میں متشددانہ قسم کی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ اس قسم کی تحریکوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ مسلمان اگر اسلام کا نام لیں تو محض ان کے نام لینے سے ان کی تحریک اسلام سے منسوب نہیں ہو جائے گی۔

۲۶ بنگلور میں ۳۰ جنوری ۱۹۹۴ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ انڈین نیشنلزم کے اجزا ترکیبی کیا ہیں۔ یہ سیمنار ہندستانی اندولن کی طرف سے منظم کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔

۲۷ ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز کی طرف سے نئی دہلی میں ۳ - ۷ فروری ۱۹۹۴ کو ایک عالمی مذاہب کانفرنس ہوئی۔ اس میں ۵۲ ملکوں کے لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس کے دو

پروگرام میں شرکت کی۔ ۳ فروری کو پیس مارچ تھا جو ریلوے اسٹیشن سے شروع ہو کر لال قلعہ پر ختم ہوا۔ ۶ فروری کو اس کا عام اجلاس ہوا جس میں تقریباً دو لاکھ آدمیوں نے حصہ لیا۔ اس میں دلائی لاما بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے مختصر تقریر میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۳۸ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے کانفرنس ہال میں ۸ فروری ۱۹۹۴ کو ایک سینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مذہب اور انسان دوستی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔

۳۹ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر منورنجن بھارتی نے ۹ فروری ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر قدیم دہلی اور جدید دہلی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دہلی کے مسائل اضافہ آبادی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اضافہ کرپشن کا نتیجہ ہیں۔

۴۰ مراکو کے ملک الحسن الثانی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے فروری ۱۹۹۴ میں مراکو کا سفر کیا۔ وہاں کے مختلف پروگراموں میں شرکت کی اور بہت سے عرب شیوخ سے ملاقاتیں کیں۔ اس سفر کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۱ قُسَنطینہ (الجزائر) کی جامعۃ الامیر عبدالقادر للعلوم الاسلامیہ کے ایک طالب علم بشیر قلانی نے اپنے ریسرچ کے مقالہ کا موضوع یہ مقرر کیا ہے: أُسسُ البعث الحضاری بین مالك بن نبی و وحید الدین خان۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ضروری معلومات طلب کی ہیں جو ان کو بھیج دی گئی ہیں۔

۴۲ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۰ فروری ۱۹۹۴ کو نشر کی گئی۔ یہ تقریر رمضان کے روزہ کے بارہ میں تھی۔ اس میں بتایا گیا کہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کو صابرانہ طور پر گزارنے کے لئے تیار کیا جائے۔

۴۳ صدر اسلامی مرکز نے بھارتیہ ودیا بھون کی دعوت پر نومبر ۱۹۹۳ میں بمبئی کا سفر کیا۔ اور وہاں چند اجتماعات میں خطاب کیا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۴ ملکی دوروں کے سلسلہ میں ایک کتاب "اسفارِ ہند" تقریباً تیار ہے۔ اِن شاء اللہ جلد شائع ہو گی۔ اس کا تعلق زیادہ تر غیر مسلموں کے درمیان اسفار سے ہے۔

ہندستانی مسلمان

از :—— مولانا وحیدالدین خاں

زندگی میں ہمیشہ مسائل بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مواقع اور امکانات بھی۔ یہ صحیح رہنمائی نہیں ہے کہ مسائل کو ڈھونڈ کر نکالا جائے اور ان کو بتا کر لوگوں کو مایوسی اور پست حوصلگی میں مبتلا کیا جائے۔ سچی رہنمائی یہ ہے کہ مواقع کی نشاندہی کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر عمل کا حوصلہ پیدا ہو۔ پیش نظر کتاب میں یہی دوسرا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں ٹھوس حقائق کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ہوش مندی سے کام لیا جائے تو اس ملک میں مسلمانوں کے لئے ترقی کے وہ تمام امکانات پوری طرح موجود ہیں جو کسی بھی دوسرے مقام پر ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

صفحات ۲۱۶ قیمت ۴۰ روپیہ

نئی اور زیر طبع مطبوعات

		صفحات	قیمت
عظمتِ اسلام	از مولانا وحیدالدین خان	292	Rs. 50
مضامینِ اسلام	"	176	Rs. 30
کتابِ زندگی	"	248	Rs. 40
علمِ کلام	"	48	Rs. 9

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333